روسی انقلاب کی تاریخ

از، لیون ٹراٹسکی

ترجمہ:اسد پتافی

حصہ اول، باب 1

زارروس کا خاتمہ،روسی ارتقا کی خصوصیات

روسی تاریخ کے ارتقا کا بنیادی اور سب سے اہم عنصر،اس کی ارتقائی سست روی ہے جو معاشی پسماندگی،سماجی قدامت پرستی، اور ان سے پیدا ہونے والی ثقافتی سطح کی پستی پر مبنی ہے۔اس وسیع وعریض اور درشت خطے کی آبادی ،جومشرقی ہواؤں اور ایشیائی ہجرتوں کے لئے کھلی رہی ہے،اپنی طویل پسماندگی کے باعث فطرت کے عتاب کا شکار رہی ہے۔خانہ بدوشوں کے خلاف جدوجہد تقریباً 17 ویں صدی کے اختتام تک جاری رہی جبکہ ہواؤں کے خلاف جدوجہد، جو سردیوں میں ٹھنڈک اور گرمیوں میں خشک سالی لاتی ہیں،آج تک جاری ہے۔زراعت نے ،جو تمام ترقی کی بنیاد ہے،توسیعی طریقوں سے پیشقدمی کی۔شمال میں جنگلوں کو کاٹ کر جلا دیا گیا جبکہ جنوب میں سرسبز وشاداب گھاس کے میدانوں کو تاخت وتاراج کر

دیا گیا۔فطرت کے خلاف یہ لڑائی وسیع تو تھی لیکن گہری نہیں تھی۔

جب مغربی وحشی ،رومن ثقافت کی خانماں بربادی کی جگہ آباہورہے تھے تو ان کوئی پتھر ملے جنہیں تعمیراتی مقاصد کیلئے استعمال کیا گیا۔جبکہ مشرق میں سلاویوں کو اس قسم کی کوئی وراثت نہیں مل سکی۔ان کے پیشرو،ان سے بھی کم ثقافتی سطح کے حامل تھے۔مغربی یورپ کے لوگوں کو جلد ہی اپنی قدرتی سرحدوں کا پتہ چل گیا اور انھوں نے اپنے معاشی اور ثقافتی مراکز یعنی تجارتی شہر آباد کر لئے۔مشرقی خطے کی آبادی کو آباد ہونے کے لئے جنگل کا رخ کرنا پڑا،یا انہیں علاقے میں پھیل جانا پڑا۔مغرب میں کسانوں کے زیادہ جوشیلے اور منچلے عناصر،شہری،دستکار اور تاجر بن گئے۔جبکہ مشرق میں زیادہ چست و چالاک لوگوں میں سے کچھ کاروباری بن گئے اور بہت سے Cossacks فوجی اور پیادے بن گئے۔سماجی ترتیب و تقسیم کا عمل جو مغرب میں تیز اور شدید تھا،مشرق میں بہت سست رو تھا اور وسعت پذیری کے عمل کے باعث بہت محدود تھا۔پیٹر اول کے ہمعصر Vicko کے الفاظ میں ”مسکوویا کا زار ،ایک عیسائی ہونے کے باوجود،سست الدماغ لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔اور مسکوویا کے لوگوں کی سست الدماغی،معاشی ترقی کی سست روی ،طبقاتی تعلقات کی بے صورتی اور اندرونی تاریخ کی نقاہت کی عکاسی کرتی

ہے۔

مصر، ہندوستان اور چین کی قدیم تہذیبیں، اپنے اندر خود کفیل کردار کی حامل تھیں۔ اور ان کے پاس کم پیداواری قوتوں کے باوجود بے پناہ وقت تھا کہ وہ اپنے سماجی تعلقات کو اس نکتہ تکمیل تک لے جائیں، جہاں ان کے ہنر مند اپنے ہنر کو پیداوار حاصل کرنے کے قابل بنا سکیں۔ روس بھی ایشیا اور یورپ کے درمیان، نہ صرف جغرافیائی بلکہ تاریخی اور سماجی طور پر بھی کھڑا ہوا۔ وہ نہ صرف مغرب کے یورپ بلکہ مشرق کے ایشیا سے مختلف اوقات اور مختلف عوامل میں کسی نہ کسی طرح منفرد اور ممتاز رہا۔ مشرق نے اسے وحشی تا تاری دئے جو روسی ریاست کے ڈھانچے کے لئے اہم عامل کے طور پر داخل ہوئے۔ لیکن مغرب ابھی تک اس سے کہیں زیادہ خطرناک دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک استاد بھی تھا۔ روس مشرق میں تعمیر و ترقی پر توجہ نہیں دے سکا کیونکہ اسے مغرب کی طرف سے مسلسل معاشی اور فوجی دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ روس میں جاگیرداری تعلقات کی موجودگی کو، بعد میں ہونے والی تحقیقات میں غیر مشروط استواری قرار دیا گیا جس سے سابقہ مورخوں نے ہمیشہ انکار کئے رکھا تھا۔ اس کے باوجود روسی جاگیرداری کے بنیادی عناصر ویسے ہی تھے جیسے مغرب میں تھے۔ لیکن یہ کھلی حقیقت کہ

جاگیرداری عہد کی موجودگی کو توسیعی دلیلوں سے تشکیل دیا گیا،روسی جاگیرداری کی بے صورتی،ادھورے پن اور ثقافتی معیار کی پستی کی واضح نشاندہی کرتی ہے۔ایک پسماندہ ملک ترقی یافتہ ملکوں کی مادی اور دانشورانہ فتوحات کو جذب کرلیتا ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ یہ سب کچھ غلامانہ طریقے سے کرتا ہےاور ماضی کےان تمام مرحلوں سے گذرتا ہےجن سے ترقی یافتہ ملک گزر چکے ہوتے ہیں۔ Vicko اور اس کے حالیہ مقلدوں کا، تاریخی دائروں کو دہرائے جانے کانظریہ،قدیم قبل از سرمایہ داری کلچر کے مداروں اورکسی حدتک سرمایہ دارانہ ترقی کے ابتدائی تجربوں کے مشاہدے پرمبنی ہے۔اگرکسی نئی صورتحال میں ثقافتی مرحلوں کو دہرایا بھی گیاتو اس کی بڑی وجہ اس تمام عمل کا تنگ نظراورفروعی کردارتھا۔تاہم سرمایہ داری نظام سے مراداس تمام صورتحال کو پیچھے چھوڑ جانا ہوتا ہے۔سرمایہ داری نظام،عالمگیریت اورانسانی ترقی کے دوام کے لئے تیار بھی کراتا ہے اور ایک مخصوص سطح پراسے محسوس بھی کراتا ہے۔اس حوالے سے مختلف قوموں کا ترقی کے مرحلوں کو دہرانا،ناممکن ہے۔ترقی یافتہ ملکوں کی تقلید پرمجبور ہونے کے باوجود،ایک پسماندہ ملک چیزوں کو اسی انداز میں نہیں لیا کرتا۔تاریخی پسماندگی کی مراعت،اوراس مراعت کا وجود ہوتا ہے،اجازت دیتی ہے یا

مجبور کرتی ہے کہ لمحہ موجود میں موجود چیزوں کو موجود حالت میں اختیار کر لیا جائے، وہ بھی ان کی تیاری کے ابتدائی مرحلوں میں جائے بغیر۔

جنگلیوں نے اپنے تیر کمان یکدم پھینک کر بندوقیں اٹھا لیں، وہ بھی ان دونوں ہتھیاروں کے مابین موجود ماضی کے راستے کو طے کئے بغیر۔ امریکہ میں یورپی آباد کاروں نے قطعی طور پر تاریخ کی ابتدا، الف بے سے نہیں کی تھی۔ امریکہ اور جرمنی کی برطانیہ پر معاشی برتری کی حقیقت، ان دونوں کے سرمایہ دارانہ ارتقا کی پسماندگی کی مرہون منت ہے۔ دوسری طرف برطانیہ میں کوئلے کی صنعت کی قدامت پرست انارکی، جو مکڈونلڈ اور اس کے ساتھیوں کے سر میں بھی موجود ہے، اس ماضی کا کفارہ ادا کر رہی ہے، جب برطانیہ نے سرمایہ دارانہ رہبری کا طویل فریضہ سرانجام دیا تھا۔ تاریخی طور پر پسماندہ قوموں کی ترقی، لازماً ان کو تاریخی عمل کے مختلف مرحلوں کے اتصال کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کی ترقی مجموعی طور پر غیر منصوبہ بند، پیچیدہ، اور ملی جلی ہوتی ہے۔ تاہم تدریجی مرحلوں سے بچ نکلنے کا امکان کسی طور حتمی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے درجے کا تعین، بڑی حد تک اس ملک کی معاشی اور ثقافتی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ اپنی قدیم ثقافت میں ان بیرونی حاصلات کو اپناتے ہوئے پسماندہ قوم کبھی بھی ان کی قدر و منزلت میں کمی

نہیں کرتی۔تحلیل کا یہ عمل اپنے اندر ایک متضاد کردار کا حامل ہوتا ہے۔چنانچہ مغربی تکنیک اور تربیت،اور ان میں بھی سب سے اہم فوجی اور صنعتی تکنیک،کو متعارف کراتے ہوئے،پیٹراوٗل کے دور میں غلامی کو لیبر آرگنائزیشن کی ابتدائی صورت کے طور پر مضبوط کیا گیا۔یورپی آلات جنگ اور یورپی قرضے،جو بلاشبہ دونوں ایک اعلیٰ کلچر کی مسلمہ پیداوار تھے،نے زارشاہی کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کیا اور جس نے آگے چل کر ملک کی ترقی کے عمل کو کمزور کر دیا۔

تاریخی قوانین کا نمائشی تصورات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوا کرتا ۔تاریخی عمل کا سب سے عمومی قانون،نابرابری،اپنا سب سے تیز اور پیچیدہ اظہار پسماندہ ملکوں کی تقدیر کی صورت میں کرتا ہے۔خارجی ضرورت کا چابک ان کی پسماندہ ثقافت کو جست لگانے پر مجبور کرتا ہے۔نابرابری کے اس عالمگیر قانون سے ایک اور قانون کا ظہور ہوتا ہے،جسے ہم ایک بہتر نام دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے،مشترکہ ترقی کا قانون کہہ سکتے ہیں۔جسے ہم ایک ہی سفر کے مختلف مگر جڑے ہوئے مرحلے،دو مختلف عوامل کا اشتراک،یا قدیم کی جدید صورتوں کے ساتھ آمیزش قرار دے سکتے ہیں۔اس قانون کو اس کی تمام مادی خصوصیات سمیت سمجھے اور لاگو کئے بغیر

،روسی تاریخ کو سمجھنا نا ممکن ہے۔اور صرف روس ہی نہیں بلکہ دوسرے،تیسرے اور دسویں درجے کی ثقافت کے حامل کسی بھی ملک کی تاریخ کونہیں سمجھا جاسکتا۔

اپنے سے امیر یورپ کے دباؤ میں آ کر روسی ریاست کو یورپ کی نسبت،عوام کی دولت کا بہت بڑا حصہ نگلنا پڑا،اس طرح اس نے نہ صرف عوام کے گلے میں غربت کا طوق ڈال دیا بلکہ اس سے قابض طبقات کی بنیاد وں کوبھی کمزور کر دیا۔اسی دوران،آخرالذکر کی حمایت کی ضرورت نے اسے ان کی نشو ونما اور دستہ بندی کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔جس کے نتیجے میں افسر شاہی کا مراعات یافتہ طبقہ اپنی مطلوبہ بلندی و برتری حاصل نہیں کر سکا۔اورروسی ریاست ایک ایشیائی مطلق العنانیت کی صورت اختیار کرگئی۔سولہویں صدی کے آغاز میں بازنطینی مطلق العنانی،نے جسے مسکوویہ کے زار نے سرکاری طور پر اختیار کیا تھا،''بویاری'' جاگیرداروں کواشرافیہ کی مدد سے اپنی عملداری میں لیااور پھر کسانوں کواشرافیہ کا غلام بنا کراشرافیہ کواپنا مغلوب کر لیا۔اور یہی وہ بنیادیں تھیں جن پر سینٹ پیٹرز برگ کی مطلق العنانیت قائم ہوئی تھی۔اس سارے عمل کی پسماندگی ،مطلق العنانیت کی حقیقت سے واضح طور پرجھلکتی ہے۔جوسولہویں صدی کے اختتام پر شروع

ہوئی، سترہویں صدی میں جس نے اپنی شکل وصورت بنائی، اٹھارویں صدی میں رنگ روپ نکالا، اور جس کا قانونی طور پر انہدام 1861 میں ہوا۔

پادریت نے بھی اشرافیہ کی طرح، زار کی مطلق العنانیت کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا۔ بلکہ ان کا کردار جی حضوری کا رہا اور اس بے عزتی کو اپنی عزت افزائی شمار کیا گیا۔ بڑے اور اعلیٰ پائے کے پادریوں نے شاہی طاقت کے نائبین کے طور پر اختیارات سے مکمل لطف اٹھایا۔ زار کی مرضی سے مجتہدین تبدیل کئے جاتے تھے۔ پیٹرز برگ عہد میں، چرچ کا ریاست پر انحصار اور بھی خوشامدانہ ہو گیا۔ دو لاکھ پادری اور راہب، افسر شاہی کا لازمی حصہ بن گئے تھے، یہ ایک قسم کی یسوع مسیح کی پولیس تھی۔

سلاوو پرستی، جو مسیحیت کی ایک پسماندہ شکل ہے، نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی ہے کہ روس کے لوگ اور ان کا چرچ، شروع سے آخر تک جمہوری ہیں۔ جبکہ روسی ریاست، پیٹر اعظم کی طرف سے مسلط کردہ جرمن افسر شاہی پر مبنی ہے۔ مارک نے اس تصور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بالکل اسی انداز میں المانوی احمقوں نے فریڈرک دوم کی فرانسیسیوں پر مطلق العنانیت کو موردالزام ٹھہرایا، حالانکہ پسماندہ غلاموں کو کبھی بھی اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ مہذب غلام ان کی تربیت

کریں۔'' یہ مختصر تبصرہ نہ صرف سلاوو پرستوں کے قدیم فلسفے کی قلعی کھولتا ہے بلکہ نسل پرستوں کے تازہ ترین الہام کی بھی!

نہ صرف روسی جاگیرداری بلکہ پوری قدیم روسی تاریخ کا، لاغر پن پورے قرون وسطیٰ میں، دستکاری اور تجارت کے مراکز کے طور پر حقیقی شہروں کی عدم موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ دستکاری روس میں خود کو زراعت سے علیحدہ کرنے میں مکمل ناکام رہی۔ بلکہ گھریلو صنعت کے طور پر قائم رہی۔ قدیم روسی شہر، کمرشل، انتظامی، عسکری اور جاگیرداری نوعیت کے تھے۔ جو صارفیت کے تو مرکز تھے لیکن پیداوار کے نہیں۔ یہاں تک کہ نووگراد بھی، ہانسہ شہر کی طرح جسے تاتاریوں نے اپنی عملداری میں نہیں لیا تھا، ایک تجارتی شہر تھا نہ کہ صنعتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زرعی صنعت نے کئی اضلاع میں تجارتی واسطوں کی ضرورت کو بڑی حد تک جنم دیا۔ لیکن خانہ بدوش تاجروں کیلئے وہ سماجی رتبہ ومقام حاصل کرنا ناممکن تھا جو مغرب میں دستکار گلڈ، تاجر صنعتکار پیٹی اور مڈل بورژوازی کو حاصل تھا اور جو مکمل طور پر کسان ماحول سے جڑی ہوئی تھی۔ تاہم روسی تجارت کی بڑی شاہراہیں سرحد سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، جس کی وجہ سے زمانہ بعید سے غیر ملکی تجارتی سرمائے کی برتری حاوی تھی، اور جس نے پورے عمل کو نیم نو

آبادیاتی کردار کا حامل کر دیا تھا۔جس میں روسی تاجر مغربی شہروں اور روسی دیہاتوں کے مابین محض ایک رابطے کا کام کرتے تھے۔اس نوعیت کے کاروباری تعلقات نے آگے چل کر روسی سرمایہ داری کے عہد میں اور بھی فروغ پایا۔اور اس نے سامراجی جنگ میں اپنا شدید ترین اظہار بھی کیا۔روسی شہروں کی غیر اہمیت نے جہاں سب سے بڑھ کے اسے ایشیائی ریاست کے طور پر ترقی دی، وہیں اس نے اصلاح پسندی کو بھی ناممکن بنا دیا۔یعنی یہ جاگیردارانہ افسر شاہانہ آرتھوڈاکسی کو کسی جدید شکل کی عیسائیت میں نہیں بدل سکی جو ایک بورژوا سماج کو اختیار کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتی۔ریاستی چرچ کے خلاف جدوجہد، کسانوں کو فرقوں میں تقسیم کرنے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ان میں قدیم معتقدین کا دھڑا سب سے طاقتور تھا۔

عظیم فرانسیسی انقلاب سے پندرہ سال پہلے روس میں یورال کے مقام پر، کوساکوں، کسانوں، غلام کارکنوں کی تحریک پھٹ پڑی، جسے پوگاچوف بغاوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس خطرناک مقبول عوامی بغاوت میں کیا کمی تھی جو اسے انقلاب میں نہیں بدل سکی؟ وہ تھی ایک تیسری سیاسی سماجی طاقت۔شہروں کی صنعتی جمہوریت کے بغیر کسانوں کی جنگ انقلاب میں نہیں بدل سکتی تھی۔جس طرح کسان دھڑے، کسی اصلاح پسندی کے مقام

کو نہیں پہنچ سکتے۔ پوگا چوف تحریک کے نتائج الٹ برآمد ہوئے۔اس سے افسر شاہانہ مطلق العنانی کو اشرافیہ کے مفادات کے نگران کے طور پر مزید تقویت ملی۔خطرے کی اس گھڑی میں اس نگران نے اپنی اہمیت کو اور بھی منوا لیا۔

یورپ کے رنگ میں رنگے جانے کا عمل، جس کا ویسے تو آغاز پیٹر کے دور میں ہی ہو چکا تھا، اس سے اگلی صدی میں اور بھی زور پکڑ گیا اور یہ حکمران طبقے اور اشرافیہ کی ضرورت بن گیا تھا۔1825 میں اشرافیہ کے دانشوروں نے اس مطالبے کو سیاسی رنگ دے دیا اور معاملات ایک فوجی سازش تک چلے گئے تا کہ مطلق العنانیت کے اختیارات کو کم کیا جا سکے۔یورپی بورژوازی کی ترقی کے دباؤ کے تحت ترقی پسند اشرافیہ نے ''تیسری سیاسی سماجی طاقت'' کی کمی پوری کرنیکی کوشش کی۔تاہم پھر بھی وہ اپنی آزاد خیال حکومت اور اپنے طبقاتی تسلط کے مفادات کے اشتراک کے خواہشمند تھے اور ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں نیچے سے کسان بغاوت نہ کر دیں۔یہی وجہ ہے ہے کہ سازش شاندار تھی لیکن اس سے افسر طبقہ کٹ کے رہ گیا جنہوں نے جدوجہد کئے بغیر کوشش ترک کر دی۔ڈیکابرسٹ بغاوت کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

وہ زمیندار جو فیکٹریوں کے مالک بن چکے تھے، وہ پہلا طبقہ تھے جو غلاموں کو اجرتی مزدور کا درجہ دینے کے حق میں تھے۔ روسی غلے کی بڑھتی ہوئی برآمد نے اس ضرورت کو اور بھی پختہ کر دیا۔ 1861 میں اشرافیہ افسر شاہی نے آزاد خیال زمینداروں کے بھروسے پر زرعی اصلاحات کر دیں۔ ناتواں آزاد خیال بورژوازی اس دوران چین کی بانسری بجاتی رہی۔ اس پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ زارشاہی نے روس کے بنیادی مسئلے یعنی زرعی مسئلے کو پروشیائی مطلق العنانیت سے بھی زیادہ گھناؤنے اور گھٹیا طریقے سے حل کر دیا تھا، جو اس نے جرمنی کے بنیادی مسئلے ،قومی یکجہتی، کو حل کرنے کیلئے اپنے دس سالوں میں کی تھیں۔ ایک طبقے کی طرف سے دوسرے طبقے کے مسائل حل کرنا بہت سے مشترکہ طریقوں میں سے ایک ہے جو پسماندہ ملکوں میں فطری امر ہے۔

مشترکہ ترقی کے قانون کا روسی صنعت کے کردار اور تاریخ میں انتہائی مسلمہ کردار رہا ہے۔ تاخیر سے ابھرنے کی وجہ سے یہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ترقی نہیں کر سکی۔ لیکن ترقی کا حصہ بنتے ہوئے اس نے جدید ترین حاصلات کو اپنی پسماندگی میں سمو لیا۔ جس طرح روسی معاشی ارتقا نے دستکاری گلڈ اور صنعت سازی کو مجموعی طور پر عبور کیا، اسی طرح صنعت کے مختلف

شعبوں نے تکنیکی پیداواری مرحلوں کے حوالے سے لگاتار کئی چھلانگیں لگائیں۔جن کو مغرب نے دہائیوں میں طے کیا تھا۔جس کے باعث روسی صنعت نے ایک مخصوص وقت میں انتہائی غیر معمولی رفتار سے ترقی کی۔ جنگ اور پہلے انقلاب کے درمیان، روس میں صنعتی پیداوار تقریباً دگنی ہوگئی۔اس صورتحال نے بعض روسی مؤرخوں کو یہ کہنے کی بنیاد فراہم کی ہے کہ ''ہمیں پسماندگی اور سست ترقی کی روایت کو ہر حال میں ترک کر دینا چاہئے۔'' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تیز رفتار ترقی کا تعین اسی پسماندگی نے کیا تھا۔افسوس کہ یہ نہ صرف قدیم روس کے خاتمے تک جاری رہی بلکہ اس کی یہ روایت آج تک جاری وساری ہے۔کسی بھی قوم کی معاشی سطح کی بنیادی کسوٹی، اس کی محنت کی پیداواری صلاحیت ہوتی ہے۔اور پھر جس کا انحصار عمومی ملکی معیشت میں صنعتوں کے وزن اور حجم پر ہوتا ہے۔ جنگ کے موقع پر جب زارشاہی سب سے زیادہ خوشحالی میں تھی، فی کس قومی آمدنی امریکہ سے 8 سے 10 گنا کم تھی۔اس حقیقت سے ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ روس کی خودکفیل آبادی کا 4/5 حصہ زراعت سے وابستہ ہے جبکہ امریکہ میں ایک فرد زراعت سے اور ڈھائی افراد صنعت سے وابستہ ہیں۔ہم یہ بھی اضافہ کریں گے کہ روس کی

زمین پر ہر سو مربع کلومیٹر کے حساب سے ،جنگ کے موقع پر،0.4 کلومیٹر پر ریلوے لائن موجود تھی جبکہ جرمنی میں یہ 11.7, آسٹریا اور ہنگری میں 7،اوراسی طرح ان جیسے باقی ملکوں کی تھی۔

لیکن یہ محض معیشت کا میدان تھا،جس میں،جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں،مشترکہ ترقی کا قانون پوری قوت سے لاگو ہوا۔اسی دوران،جب زرعی مقاصد کے لئے زمین کی آبادی کا عمل مجموعی طور پر،انقلاب کے برپا ہونے تک،سترہویں صدی کی سطح پر قائم رہا۔روسی صنعت اپنی تکنیک اور سرمایہ دارانہ سٹرکچر کے حوالے سے ترقی یافتہ ملکوں کے برابر کھڑی تھی، بلکہ بعض شعبوں میں تو یہ ان سے بھی آگے تھی۔چھوٹے کاروبار جن میں 100 یا اس سے کم صنعتی مزدور کام کرتے تھے 1914 میں،امریکہ میں ان کی شرح 35% تھی جبکہ روس میں یہ 17.8% تھی۔دونوں ملکوں میں یکساں طور پر ایسے ادارے،مناسب تعداد میں موجود تھے جن میں 100 سے 1000 تک مزدور کام کرتے تھے لیکن بڑی صنعتیں جن میں 1000 سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے،ان کی شرح امریکہ میں 17.8% تھی اور روس میں یہ 41.4% تھی۔بعض صنعتی مراکز میں تو یہ شرح اور بھی زیادہ تھی۔پیٹروگراڈ میں 44.4%اور ماسکو میں تو یہ 57.3% تھی۔یہی

صورتحال ہمیں روس کے جرمنی اور برطانیہ کے ساتھ موازنے میں ملتی ہے۔ان حقائق کو جنہیں میں نے پہلی بار 1908 میں مرتب کیا تھا، سے بظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ اس کا روس کی پسماندگی کے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم یہ حقیقت روس کی پسماندگی کو مسترد کرنے کی بجائے اسے جدلیاتی طور پر مکمل کرتی ہے۔

بنکوں کے سرمائے کا صنعت سے جس طرح سے اور جس حد تک سنگم روس میں مستحکم ہو چکا تھا اس کی تو کسی اور ملک میں مثال ہی نہیں مل سکے گی۔لیکن بنکوں کا صنعت سے یہ تعلق اپنے اندر، مغربی یورپ کی سرمائے کی منڈی سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ بھاری صنعت (دھات، کوئلہ، تیل) مکمل طور پر غیر ملکی مالیاتی سرمائے کے کنٹرول میں تھی۔جس نے معاون و مددگار بنکوں کے نظام کے طور پر خود کو روس میں قائم کر رکھا تھا۔چھوٹی صنعت بھی اسی راہ پر گامزن تھی۔روس کے سٹاک سرمائے کا %40 غیر ملکیوں کی ملکیت تھا۔جبکہ صنعت کے بڑے شعبوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ تھی۔کسی مبالغے کے بغیر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ روسی اداروں، بنکوں اور فیکٹریوں کے سٹاک حصص کا کنٹرول روس سے باہر تھا۔برطانیہ، فرانس اور بلجیم میں موجود سرمایہ، جرمنی میں موجود سرمائے سے دوگنا تھا۔روسی بورژوازی کے سماجی

کرداراور اسکی سیاسی شکل وشباہت کا تعین روسی صنعت کے ڈھانچے اور ماخذ کی کیفیت سے ہوتا تھا۔صنعت کے اس انتہائی ارتکاز سے ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ بڑے سرمایہ داروں اورعوام الناس کے درمیان پیشوائیت کی کوئی عبوری پرت موجودنہیں تھی۔ہم اس میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہیں گے کہ بڑے بنکوں، کارخانوں اور مواصلات کے اداروں کے مالکوں کی اکثریت غیرملکی تھی۔جن کی نہ صرف روس میں سرمایہ کاری سے حاصل ہونے منافعوں پر مضبوط گرفت تھی بلکہ غیرملکی پارلیمانوں میں بھی ان کا اثر ورسوخ تھالیکن انہوں نے روس میں پارلیمانی نظام کی جدوجہد کوآگے نہیں بڑھایا بلکہ اس کے برعکس وہ عام طور پراس کی مخالفت کیا کرتے تھے۔اس سلسلے میں فرانس کا کردارشرمناک تھا جواس نے سرکاری طور پرادا کیا تھا۔روسی بورژوازی کی غیرمقبولیت اورسیاسی تنہائی کی یہی بنیادی اور ٹھوس وجوہات تھیں۔اپنی تاریخ کے آغاز میں یہ اتنی ناپختہ تھی کہ اصلاحات کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتی تھی۔جب انقلاب کی رہنمائی کا وقت آیا تو یہ بہت زیادہ تیار ہوچکی تھی۔

ملکی ترقی کے عمومی عمل کے حوالے سے روسی محنت کش طبقے کا ظہور، دستکارگلڈوں سے نہیں بلکہ زراعت سے ہوا۔شہروں سے نہیں بلکہ

دیہاتوں سے ہوا۔مزید برآں روس میں محنت کش طبقے نے وقت کے ساتھ بتدریج ارتقا نہیں کیا، برطانیہ کی طرح یہ ماضی کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں تھا بلکہ اس نے تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول، حالات، رشتوں، اور تعلقات کے مطابق پھلانگتے ہوئے ماضی سے اپنا رشتہ تیزی سے توڑ لیا۔صرف اس حقیقت اور زار شاہی کے بدترین استحصال نے روسی محنت کش طبقے کو انقلابی نظریات کے بارے میں جرأتمندانہ نتائج اخذ کرنے اور ان سے جڑت اختیار کرنے کی شکتی فراہم کردی۔بجا طور پر، پسماندہ صنعتیں جدید ترین انداز میں سرمایہ دارانہ تنظیم میں شامل ہوئیں۔

روسی محنت کش طبقہ اپنے آغاز سے ہی اپنی مختصر تاریخ کو ہمیشہ سے دہراتا چلا آرہا تھا۔اس دوران جب دھات کی صنعت میں، خاص طور پر پیٹروگراڈ میں، موروثی پرولتاریہ کی ایک پرت کام میں اتنی مگن تھی کہ وہ پورے ملک سے کٹی ہوئی تھی جبکہ یورالز میں کام کرنے والوں کی غالب اکثریت آدھی کسان آدھی مزدور تھی۔دیہاتوں سے تازہ دم مزدوروں کے سالانہ بہاؤ نے تمام صنعتی مراکز میں پرولتاریہ کے بندھنوں کو اس کے سماجی مخزن سمیت تروتازہ کیئے رکھا۔بورژوازی کی سیاسی عمل میں نااہلی کی فوری وجہ اس کی پرولتاریہ اور کسانوں سے تعلقات کی کیفیت تھی۔مزدوروں کی

روزمرہ زندگی میں ان پر ظلم وتشدد کے باعث یہ ان کی رہنمائی سے قاصر تھی۔اسی ظلم وتشدد سے مزدوروں کو عمومی مسائل کا فوری ادراک ہوا۔کسانوں کے معاملے میں بھی یہی کیفیت تھی کیونکہ بورژوازی کے مفادات، جاگیرداروں کے مفادات سے جڑے ہوئے تھے۔اور یہ ملکیتی رشتوں کے کسی بھی صورت میں تہہ وبالا ہونے سے خوفزدہ تھی۔روسی انقلاب میں تاخیر محض تقویم کا ہی معاملہ نہیں تھا بلکہ قوم کی سماجی ساخت بھی اس کی بڑی وجہ تھی۔برطانیہ نے اپنا پروٹسٹنٹ انقلاب اس وقت کیا تھا جب اس کی آبادی محض ساڑھے پانچ کروڑ تھی۔صرف لندن کی آبادی پانچ لاکھ تھی۔فرانس میں انقلاب کے وقت پیرس کی آبادی بھی اتنی ہی تھی، جبکہ اس کی کل آبادی ڈھائی کروڑ تھی۔روس کی آبادی بیسویں صدی کے آغاز پر پندرہ کروڑ تھی،ان میں تیس لاکھ ماسکو اور پیٹروگراڈ میں آباد تھے۔ان تجزیاتی اعداد وشمار سے وسیع سماجی تفاوت کا اظہار ہوتا ہے۔نہ صرف سترہویں صدی کا برطانیہ، بلکہ اٹھارویں صدی کا فرانس بھی جدید معنوں میں پرولتاریہ سے محروم تھا۔تاہم روس میں 1905 میں،محنت کے تمام شعبوں میں،شہروں دیہاتوں میں،محنت کشوں کی تعداد ایک کروڑ سے کم نہیں تھی۔ان کے خاندان شامل کئے جائیں تو یہ تعداد ڈھائی کروڑ ہو جاتی

ہے۔ دوسرے لفظوں میں، عظیم انقلاب کے وقت کی فرانسیسی آبادی سے بھی زیادہ۔ کراموِیل کی فوج کے قوی الجثہ ہنرمندوں، آزاد کسانوں سے لے کر پیرس کے انقلابیوں۔۔اور سینٹ پیٹرز برگ کے صنعتی مزدوروں تک کے سفر میں، انقلاب نے اپنے سماجی شعوری عمل، اپنے طریق کار، یہاں تک کہ اپنے مقاصد میں گہری تبدیلیاں کر لی تھیں۔

1905 کے واقعات 1917 کے دو انقلابات، فروری اور اکتوبر، کی تمہید تھے۔ اس میں کھیل کے تمام عناصر موجود تھے لیکن یہ اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ سکا۔ روس جاپان جنگ نے زارشاہی کو ڈگمگا دیا تھا۔ ایک عوامی تحریک کے پس منظر کے خلاف، لبرل بورژوازی بادشاہت کی مخالفت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مزدوروں نے بورژوازی کے بغیر بورژوازی کیخلاف خود کو ایک تنظیم میں منظّم کر لیا تھا، جو بعد میں سوویت قرار پائی۔ کسان تحریکوں نے پورے ملک میں زمینوں پر قبضے کر لئے تھے۔ نہ صرف کسان، بلکہ فوج کے کئی انقلابی حصے بھی سوویتوں کا دست و بازو بن گئے۔ یہ سوویتیں تناؤ کے شدید ترین لمحات میں، بادشاہت کی قوت سے ٹکرا گئیں۔ لیکن چونکہ تمام انقلابی قوتیں پہلی بار عمل میں جا رہی تھیں، اس لئے ان میں تجربے اور اعتماد کی کمی تھی۔ لبرلز، کھلم کھلا عین اس وقت انقلاب سے

پیچھے ہٹ گئے، جب یہ واضح ہو گیا تھا کہ صرف زار شاہی کو جھٹکا دینا کافی نہیں، بلکہ اسے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔عوام کے ساتھ بورژوازی کی ،جمہوریت پسند اہل دانش کی تائید و آشیر باد کے ساتھ اچانک بے وفائی نے بادشاہت کے لئے فوج میں امتیاز اور تفریق کرنے کا رستہ ہموار کر دیا۔وفادار دستے الگ کر لئے گئے۔تا کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کی سرکشی کا خونریز مزہ چکھایا جائے۔چند معمولی زخموں کے ساتھ،زار شاہی 1905 کے تجربے سے نہ صرف،زندہ سلامت بچنے میں کامیاب رہ گئی بلکہ اس نے مزید طاقت حاصل کر لی۔

1905 اور 1917 کے درمیانی سالوں کے دوران کے تاریخی ارتقا نے قوتوں کے باہمی تعلق میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں؟ زار شاہی کو اس تاریخی ارتقا کے تقاضوں کے ساتھ سخت تصادم سے نبرد آزما ہونا پڑا۔بورژوازی معاشی طور پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگئی۔لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کہ اس کی طاقت،صنعت کے بہت بڑے ارتکاز اور ایک مسلسل بڑھتے ہوئے غیر ملکی سرمائے کے تسلط پر مبنی تھی۔1905 کے تجربے نے بورژوازی کو مزید قدامت پسند اور محتاط بنا دیا تھا۔پیٹی بورژوازی کی قدر و قیمت جو پہلے ہی کم تھی مزید کمتر ہوگئی۔جمہوریت کا راگ الاپنے والے اہل دانش

،عوام سے کٹے ہوئے اورٹھوس سماجی حمایت سے محروم تھے۔ یہ کسی حد تک سیاسی طور پر اثر انداز ہو سکتے تھے لیکن کوئی آزادانہ کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ بورژوا لبرل ازم پر ان کا انحصار بہت حد تک بڑھ چکا تھا۔ان حالات میں نوجوان اور تازہ دم پرولتاریہ ہی، کسانوں کو ایک پروگرام، ایک پلیٹ فارم اور ایک قیادت فراہم کر سکتی تھی۔ان عظیم اہداف اور مقاصد نے پرولتاریہ میں ایک خاص انقلابی تنظیم کی فوری ضرورت کا احساس پیدا کیا جو عوام کا ساتھ دے سکے اور ان کو محنت کشوں کی زیر قیادت، انقلابی اقدامات کیلئے تیار کر سکے۔ہم دیکھتے ہیں کہ 1905 کی سوویتیں، 1917 میں بڑی تیزی سے اور بہت بڑے پیمانے پر پھیلیں۔ یہاں ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ یہ سوویتیں، روس کی تاریخی پسماندگی نے جنم نہیں دی تھیں بلکہ یہ اس کی مشترکہ ترقی کی پیداوار تھیں اور اس کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ دنیا کے بہت بڑے صنعتی ملک جرمنی کا پرولتاریہ 1919-1918 کے انتہائی انقلابی لمحات میں کوئی تنظیمی صورت تلاش نہیں کر سکا تھا۔

تاحال 1917 کے انقلاب نے افسر شاہانہ مطلق العنانی کے خاتمے کا فوری ہدف پورا کرنا تھا۔لیکن قدیم بورژوازی انقلابات کی بہ نسبت، اب فیصلہ کن قوت ایک نیا طبقہ تھا جس کی تعمیر و تشکیل ایک مرتکز صنعت کی بنیادوں

پر ہوئی تھی اور جو نئی تنظیموں اور جدوجہد کے نئے طریقوں سے مسلح تھا ۔یہاں مشترکہ ترقی کا قانون اپنا انتہائی اظہار کرتا نظر آتا ہے۔قرون وسطٰی کے انحطاط پذیر ڈھانچے کو اکھاڑ پھینکنے سے آغاز کرتے ہوئے،انقلاب نے اقتدار چند ہی ماہ میں پرولتاریہ اور کمیونسٹ پارٹی کی جھولی میں ڈال دیا۔

اپنے ابتدائی فریضے کے طور پر، روسی انقلاب ایک جمہوری انقلاب تھا۔لیکن اسے سیاسی جمہوریت کے مسئلے کا نئی شکل میں سامنا کرنا پڑا۔اس دوران جب مزدور پورے ملک میں سوویتیں قائم کر رہے تھے،کسانوں اور فوجیوں کو ان میں شامل کر رہے تھے،بورژوازی یہ بھاؤ تاؤ کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ کیا ہم آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کر سکیں گے یا نہیں؟ آگے چل کر یہ سوال اپنی پوری شدت سے ہمارے سامنے آئے گا۔یہاں ہم چاہیں گے کہ انقلابی نظریات اور کیفیات کی تاریخی جانشینی کے حوالے سے سوویتوں کے مقام کی نشاندہی کریں۔

سترہویں صدی کے درمیان میں برطانیہ کا بورژوازی انقلاب،ایک مذہبی اصلاح پسندی کے بہروپ میں سامنے آیا تھا۔اپنی اپنی مرضی سے عبادت کرنے کے حق کے لئے کی جانے والی جدوجہد کو،بادشاہ،اشرافیہ،چرچ کے شہزادوں اور ویٹی کن ،روم، کے خلاف

جدوجہد سمجھ لیا گیا تھا۔کلیسا اور پروٹسٹنٹ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس زمین پر''مشیت ایزدی'' کے ناقابل تسخیر تحفظ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔وہ مقاصد جن کے لئے نئے طبقے جدوجہد کر رہے تھے،شعوری طور پر بائبل کی تعلیمات اور چرچ کے پندونصائح سے خلط ملط ہو چکے تھے۔تارکین وطن خون میں لتھڑی اس روایت کو سمندر پار لے کے واپس گئے۔اس طرح سے قدیم انگریز اپنی غیر معمولی مردانگی کی صورت میں عیسائیت کی تشریح کیا کرتے تھے۔آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح عظیم برطانیہ کے''سوشلسٹ'' وزیر اپنی بزدلی کو چھپانے کے لئے ایسے جادوئی الفاظ کا آسرا لیتے ہیں،جن کے ذریعے سترہویں صدی کے لوگ اپنی بہادری کا جواز فراہم کرتے تھے۔

فرانس میں جو اصلاحات کے عمل سے گذرا تھا،انقلاب تک کیتھولک چرچ کو ریاستی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔جس نے اپنا اظہاراور جواز بورژوا سماج کے اہداف کی شکل میں کیا،وہ بھی بائبل کی تعلیمات کی نہیں، بلکہ جمہوریت کی تجریدیت کی روشنی میں۔آج فرانس کے حکمران، Jacobinism سے جتنی بھی نفرت کا اظہار کریں،حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلابی لیڈر Robespierre کی جانگداز محنت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ ابھی

تک اس قابل ہیں کہ اپنی قدامت پسند حکمرانی کے لئے ان طریقوں کو اپنا سکیں، جنہوں نے پرانے نظام کو بھک سے اڑا دیا تھا۔

تمام عظیم انقلابات، بورژوا سماج کیلئے نئے مرحلوں کا باعث بنے ہیں۔ اور اس سماج میں موجود طبقات کیلئے شعور کی نئی شکلیں بھی فراہم کی ہیں۔ جس طرح فرانس اصلاحات سے اور روس رسمی جمہوریت سے آگے نکل گیا۔ روسی انقلابی پارٹی، جس نے پورے عہد پر اپنے اثرات مرتب کرنے تھے، نے انقلاب کے فریضے کی ادائیگی کیلئے نہ تو بائبل سے رجوع کیا اور نہ ہی سیکولرزدہ عیسائیت سے، جسے ''خالص'' جمہوریت کہا جاتا ہے۔ بلکہ اس نے سماج میں موجود طبقات کے مادی تعلقات میں سے انقلاب کو تخلیق اور تعمیر کیا۔ سوویت نظام نے ان تعلقات کو سادہ ترین، خوبصورت ترین اور صاف ترین اظہار فراہم کیا۔ پہلی بار سخت محنت کرنے والوں کے کردار کو سوویت نظام میں تسلیم کیا گیا۔ اپنے ابتدائی نشیب وفراز سے ہٹ کر یہ ناقابل تسخیر طور پر عوام کے شعور میں پیوست ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اصلاحات یا خالص جمہوریت کے دور میں ہوا تھا۔

حصہ اول؛ زار کا زوال

باب دوم؛ زار روس جنگ میں

روس کی جنگ میں شمولیت اپنے مقاصد اور اہداف دونوں اعتبار سے اندرونی تضادات سے بھر پور تھی۔ یہ وحشی اور خونی جنگ محض دنیا پر اپنے اپنے تسلط کیلئے آغاز کی گئی تھی۔ اس پس منظر میں روس کی اس میں شمولیت ،اس کی اوقات سے زیادہ کا اقدام تھا۔ اپنے کردار کے حوالے سے روس کا جنگی ہدف علاقائی نوعیت (ترک علاقے ،گالیشیا اور آرمینیا) تک ہی محدود تھا۔ اور اس کا فیصلہ متحارب فریقین کے مفادات کی حساسیت اور ان کے تحفظ کی ضرورت کی مناسبت سے ہونے والے واقعات نے ہی کرنا تھا۔ اسی دوران ہی ایک بڑی طاقت کے طور پر، روس جدید ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہونے کیلئے گھسٹ گھسٹ کر چلنے کے اہل بھی نہیں تھا، ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے وہ جنگ کیلئے درکار فیکٹریاں، ریلوے لائنیں، تیز رفتار فائرنگ کرنے والی بندوقیں، اسلحہ کے ڈپو اور طیارے بنانے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ روس پر لکھنے والے نئے مورخین، جو آج روس کی سامراجی پالیسیوں کو اختیار کرنے کی اشتہاء پر لکھتے نہیں تھکتے ہیں ،اسی روایتی اندھی تقلید کو اپنائے ہوئے ہیں جو مورخین کا شیوہ رہی ہے وہ روس پر

لکھتے وقت اسے عالمی منظر نامے میں ایک آزاد اور الگ وجود کے طور پر ہی دیکھتے سمجھتے ہیں، جو یہ تھا لیکن سارے نظام کا ایک کل پرزہ ہی تھا۔

انڈیا نے جنگ میں، برطانوی نوآبادیاتی کی حیثیت سے لازمی اور عمومی حصہ لینا ہی تھا۔ چین کی جنگ میں شمولیت بظاہر رضا کارانہ تھی لیکن یہ ایک غلام کی درحقیقت اپنے آقاؤں کی لڑائی میں مداخلت ہی تھی، جبکہ روس کی مداخلت کو ہم فرانس اور چین کی مداخلت کے درمیان کی کوئی چیز قرار دے سکتے ہیں۔ روس کو اس ضمن میں ترقی یافتہ اقوام کا دست نگر اتحادی بننے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اسے سرمایہ درآمد کرنا پڑا اور اس پر بھاری سود دینا پڑا، یہ ضروری تھا تا کہ وہ اپنے اتحادیوں کے سامنے اپنی آن بان کا مظاہرہ کر کے اپنے چھوٹے اور کمزور ہونے کو چھپا سکے اور یہ اس لئے بھی لازمی تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹے پسماندہ اور کمزور ہمسایوں ترکی، پرشیا، گالیشیا وغیرہ پر اپنی دھاک بھی بٹھا سکے۔ روسی بورژوازی کا یہ دہرا سامراجی کردار دراصل بڑی عالمی طاقتوں کی ایجنٹی کی غمازی کرتا تھا۔

چین کے معاشی و اقتصادی منتظم (compradors) قومی بورژوازی کی کلاسیکل شکل ہیں، یہ ایک ایسی درمیانی ایجنسی کا کردار ادا کرتے ہیں جو اپنے ملک کی معیشت اور غیر ملکی سرمائے کے درمیان رابطے

اور تعاون کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ جنگ سے قبل طاقت کی عالمی رینکنگ میں روس کا مرتبہ چین سے بہرحال کسی درجے بلند ہی تھا۔ جنگ کے بعد اس پوزیشن پر کیا فرق پڑتا، اگر وہاں انقلاب نہ آتا، یہ ایک مختلف سوال ہے۔ لیکن ایک طرف روس کی حاکمیت اعلیٰ اور دوسری طرف روس کی بورژوازی دونوں ہی دلالی اور ہڈحرامی کے اجزائے ترکیبی سے مزین تھے اور اس کا اظہار ہر طرح سے ہر طرف سے عیاں ہوتا تھا۔ انہوں نے غیر ملکی سامراج کے ساتھ اپنے روابط کی بنیاد پر اپنی نشوونما کرتے ہوئے اپنے آپ کو ترقی وخوشحالی سے ہمکنار کیا، انہوں نے سامراج کی تن من سے خدمت کی اور سامراج کی سپورٹ کے بغیر ان کی بقا ہی ممکن نہیں تھی، ہم پھر دہرائے دیتے ہیں کہ اس سپورٹ کے بغیر ان کی بقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ روس کی یہ نیم دلال بورژوازی عالمی سامراج کے مفادات کا اسی طرح خیال رکھا کرتی تھی جس طرح کوئی ایجنٹ کمیشن لے کر اپنے مالک کیلئے خدمات سرانجام دیا کرتا ہے۔

فوج کسی بھی جنگ کا بنیادی اوزار ہوا کرتی ہے۔ ہر قومی تشخص کے تناظر میں ہر فوج کو تصوراتی سطح تک ناقابل تسخیر سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے چنانچہ روس کے حکمران طبقے نے بھی زار روس کی افواج کے بارے بھی ایسا

ہی ایک طلسماتی تاثر قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوئی تھی۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ فوج صرف مقامی نیم وحشی عناصر، کمزور ہمسایوں اور منتشر و مضمحل علاقوں کے سامنے ہی شیر بن سکتی تھی۔ یورپ کی طرف رخ کرتے ہوئے اس کا رویہ عاجزانہ اتحادیوں والا ہو جایا کرتا تھا۔ اور اگر اس کو دفاع پر اترنا پڑ جاتا تو یہ خلاؤں کی وسعتوں میں گھورنے، آبادیوں میں گم ہو جانے اور سڑکیں ناپنے کے علاوہ کسی قابل نہیں تھی۔ ان کو دیکھ کر ہمیں غلاموں کی فوج کا ہیرو، سواروف یاد آتا ہے۔ فرانسیسی انقلاب نے اپنی ابتدا میں ہی ایک نئے سماج اور نئے فوجی فنون کی ترتیب و تشکیل کے دروازے کھول دئے تھے جس نے سواروف جیسی فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔ غلامی کے نیم خاتمے اور عالمگیر فوجی خدمات کے تعارف نے فوج کو صرف اس حد تک جدید کیا تھا کہ اگر یہ کوئی ملک رکھتی تھی! اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے فوج کو ایک ایسی قوم کے تضادات سے واسطہ پڑ گیا جس نے ابھی سرمایہ دارانہ انقلاب کا مرحلہ طے ہی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ زار کی فوج مغربی خطوط پر تشکیل اور مسلح کی گئی تھی لیکن یہ سب محض دکھاوے کی حد تک ہی تھا، معیار مرتبے اور مقام میں یہ کہیں زیادہ کمتر تھی۔ ایک کسان فوج اور جدید فوجی تکنیک کے ثقافتی معیار میں قطعی طور پر کوئی تال میل ہی نہیں

تھا۔فوج کے کمانڈنگ سٹاف میں، بے اعتنائی، تنگ نظری اور حکمران طبقے کی چوری کرنے کی خصلتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ جنگ کے سر پر آتے ہی فوجی صنعت اور ٹرانسپورٹ کے دیوالیہ پن نے جنگ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی قلعی کھول کے رکھ دی تھی۔ اگرچہ پہلے دن یہی تاثر دیا گیا کہ فوج پوری طرح مسلح اور تیار ہے لیکن جونہی فوج کے جوان فوراً ہی باہر نکلنے لگے تو پتہ چلا کہ ان کے پاس نہ پہننے کیلئے جوتے ہیں اور نہ ہی لڑنے کیلئے کوئی ہتھیار! روس اور جاپان کے مابین ہونے والی جنگ میں روسی فوج یہ ثابت کر چکی تھی کہ وہ کسی اہل نہیں ہے۔ ردانقلابی عہد میں بادشاہت نے ڈوما (روسی پارلیمنٹ) کی مدد سے فوجی سٹوروں اور گوداموں کو بھر دیا تھا اور ایسے کئی اقدامات کئے جس سے فوج کی حوصلہ افزائی ہو سکے تاکہ اس کی شکست کے داغ دھوئے جاسکیں۔ 1914 کا سال ایک نئی اور پہلے سے کہیں زیادہ بھاری آزمائش لے کر سامنے آ گیا۔

اپنی فوج کیلئے سرمائے اور ساز وسامان کی فراہمی کے سلسلے میں روس کو ''اچانک'' اپنے اتحادیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے اور دامن پھیلانے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن یہ امداد بھی اس کے کسی کام نہ آسکی اور صورتحال نہ بدل پائی۔ بارود کی کمی اور اس کی تیاری کیلئے فیکٹریوں کی قلیل تعداد نے، اور اس

کی ترسیل کیلئے ریلوے لائنوں کی کمی نے بہت جلد ہی روس کو شکست و ذلت کی اتھاہ کھائی میں دھکیل دیا۔اس شکست نے روس کے قوم پرست آزاد خیالوں کو ایک بار پھر یہ احساس دلا دیا کہ ان کے آباؤاجداد بورژوا انقلاب کے فرائض سرانجام نہیں دے سکے اور یہ کہ غفلت کرنے والوں کو ہمیشہ تاریخ کو بھاری کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

جنگ کی ابتدا کے دن ہی ذلت کی ابتدا کے دن ثابت ہوئے۔چھوٹی بڑی پے درپے تباہیوں کے بعد 1915 کی بہار ،روس کیلئے حتمی شکست کے داغ دامن میں سجائے آ گئی۔

حواس باختہ جرنیلوں نے اپنی مجرمانہ نااہلی سے ہونے والی ذلت اور خجالت کا سارا غصہ پرامن شہریوں پر اتارا،ہنستی بستی آبادیوں اور لہلہاتے کھیتوں پر یہ بپھرے ہوئے لیکن ہارے ہوئے شیر جوان،ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ تاراج کر دیا۔اپنے ہی لوگوں پر وہ قیامت ڈھائی گئی کہ ان کی چیخیں نکل گئیں،اور یوں باہر جو شکست کا شوروغوغا مچ رہا تھا اسے اندر اپنے عوام کی چیخوں اور سسکیوں میں دبا دیا گیا۔محاذ جنگ پر درپیش صورتحال کے حوالے سے اپنے ہم منصبوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وزیر جنگ پولیوانوف نے کہا’’مجھے محاذ جنگ کے

میدانوں اوران میدانوں میں اڑتی دھول پر،اور مقدس روس کے محافظ،اعلیٰ حضرت سینٹ نکولس مرلیکسکی کی کر م نوازی پر کامل بھروسہ ہے(ڈوما،4اگست1915)ایک ہفتے بعد جنرل رسزکی نے وزراء کی میٹنگ کے سامنے اعتراف کیا''عہد حاضر کے فوجی تقاضے اورٹیکنیک بہت جدید ہیں اورہم اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں،ہم کسی صورت بھی جرمنوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے''اور یہ کوئی ایک لمحے کی کیفیت نہیں تھی۔آفیسرسٹینکیوچ ،ایک فوجی انجینئیر کے الفاظ بیان کرتا ہے''جرمنوں کے ساتھ لڑنا بے کار ہے،کہ ہم کچھ کر سکنے کے ہی اہل نہیں ہیں۔یہاں تک کہ جنگ کے نئے طور طریقے بھی ہماری شکست کا باعث بن رہے ہیں''ایسی بے شمار شہادتیں مزید بھی موجود ہیں۔ایک چیز ایک کارکردگی جو روسی جنرل مہارت اور جانفشانی سے کرتے رہے ہیں وہ ''انسانی جسموں'' کو دھڑا دھڑ محاذ پر بھیجتے رہے وہ بھی اتنی بری حالت میں کہ جانور بھی ان سے بہتر حالت میں اور بڑے اہتمام سے بھیجے جاتے ہیں۔غیر معروف بھورے سٹاف(جیسے یانشکیوچ جونکولائی نکولا ئیوچ کے اورالیگزیوف جو زار کا ماتحت تھا)نے بلا روک ٹوک اور بلا سوچے سمجھے فہرستوں پر فہرستوں مرتب کر کے جانبازوں کے جتھوں کے جتھے محاذ پر بھیجنے

کا سلسلہ جاری رکھا اور یوں خود کو اور اپنے اتحادیوں کو مطمئن کرتے رہے۔تقریباًڈیڑھ کروڑ انسانوں کو مادر وطن کی سر بلندی کے نام پر متحرک اور روانہ کیا گیا،فوجی ڈپو، بیرکیں اور دیگر تمام جگہیں انسانوں کے اس بے ہنگم اجتماع سے بھر گئیں، کہیں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، پاؤں ایک دوسرے پر پڑ رہے تھے سب ایک دوسرے پر گر رہے تھے ایک دوسرے پر آگ بگولا ہو رہے تھے۔اس قسم کے انسانوں کو جب اس قسم کے حالات میں اس قسم کی تیاری کے ساتھ محاذ پر بھیجا جائے گا تو ان سے کسی جنگجوئی کسی جانبازی کی توقع محض ایک خوش فہمی تھی جس کا نتیجہ محض شکست ہی نہیں بلکہ تباہی و بربادی کی شکل میں بھی نکلنا تھا جو نکلا بھی۔اندازاًساڑھے پچاس لاکھ انسان، ہلاک زخمی یا قیدی ہو گئے۔جبکہ فوجی بھگوڑوں کی تعداد ان گنت تھی اور جو دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔جولائی 1915 میں وزراء چیخ پڑے ''بے چارہ روس! کہاں وہ دن جب روسی جنگوؤں نے ساری دنیا کو اپنا زیر نگیں کر لیا تھا اور کہاں آج کے یہ ہمارے جنگجو، جو محض بزدلوں اور بھگوڑوں کی تاریخ میں اپنا نام روشن کر رہے ہیں!'' انہی وزراء نے اپنی فوج کے جرنیلوں کی شان میں ایک مذاق بھی گھڑ لیا کہ ''شکست کھانے میں ، ہماری فوج سے زیادہ کوئی اور فوج بہادر نہیں ہے' اٹھتے بیٹھتے اسی مذاق کی

جگالی کرتے ہوئے جس سنجیدہ معاملے کے بارے وہ تشویش میں مبتلا ہو چکے تھے وہ یہ تھا کہ آیا کیف کے علاقے میں موجود اولیاء کی قبروں سے ان کے ڈھانچے منتقل کر دئے جائیں یا نہیں؟ زار کا موقف تھا کہ ہمیں ان کو وہیں رہنے دیا جانے چاہئے تا کہ جرمن فوج ان کو چھیڑ نہ سکے کیونکہ اگر وہ ان کو چھیڑے گی تو ان کا جلال قہر بن کر جرمنوں پر ٹوٹ پڑے گا اور ان کو شکست مبین سے دوچار کردے گا۔لیکن اسی دوران وہاں جرمن مجلس کلیسا،ان قبروں کو کھودنا شروع کر چکی تھی اور ان میں سے مقدس ہڈیاں نکال کر سنبھال چکی تھی کہ ہم جب یہاں سے واپس جائیں گے تو ان کو تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لے چلیں گے تا کہ ثواب کما سکیں! یہ صلیبی جنگوں کے دور کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ بیسویں صدی کا واقعہ ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب وائرلیس پر روس کی شکست کی خبریں آنا شروع ہو چکی تھیں!

جہاں تک آسٹریا اور ہنگری پر روس کی فتح کا تعلق ہے تو اس کی وجوہات روس میں نہیں بلکہ خود آسٹریا اور ہنگری میں ہی موجود تھیں جہاں کی منتشر و مضمحل، ہاپسبرگ بادشاہت بہت دنوں پہلے ہی اپنی بادشاہی سے بغیر کسی شرط اور مطالبے کا دستبردار ہو چکی تھی۔ ماضی میں روس آسانی سے ترکی پولینڈ اور پرشیا جیسے ملکوں کو اندر سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا

تھا۔روسی فوج کا جنوب مغربی محاذ پرآسٹریا سے مقابلہ تھا جہاں پر اسے پے درپے فتوحات حاصل ہورہی تھیں، چنانچہ یہ محاذ باقی تمام محاذوں سے مختلف ثابت ہورہا تھا۔اس محاذ سے کچھ جرنیل ابھرے جو کسی طور بھی فوجی خصوصیات کے تو حامل نہیں تھے لیکن وہ ان وحشی اور سفاک کمانڈروں کی طرح بھی نہیں تھے کہ جن کا اوڑھنا بچھونا ہی قتل وغارت گری ہوتا ہے،انہی میں سے ہی بعد میں، کئی سفید فام جرنیل خانہ جنگی کے ''ہیرو'' کے طور پر سامنے آئے۔

ہر کوئی کوشش میں تھا کہ الزام دوسرے کے سر تھوپ دیا جائے، ہر کوئی معصوم تھا اور سب خطا کار تھے۔سبھی نے مجموعی طور پر یہودیوں کو ہی مخبری کرنے کا گناہگار قرار دے دیا۔لوگوں کو چڑانے کیلئے ان کے جرمن نام رکھ دئے گئے۔رئیس اعظم نواب نکولائی نکولائیوچ کے سٹاف نے پیادہ فوج کے ایک کرنل کومیا سویادوف کو جرمن ایجنٹ ہونے کے الزام میں سزائے موت دے دی، جو کہ غلط تھی۔انہوں نے وزیر جنگ سخلمینوف کو بھی گرفتار کرلیا، جو ایک سادہ اور بے ضرر انسان تھا،اس پر سازش کا بے بنیاد الزام لگایا گیا۔برطانوی وزیر خارجہ گرے نے روسی پارلیمانی وفد کے سربراہ کے ساتھ اپنی ملاقات میں کہا کہ تمہاری حکومت کتنی بہادر ہے جو جنگ کے

شروع ہوتے ہی اپنے وزیر جنگ کو سازش کرنے کا الزام لگا کر گرفتار کرنے کی ہمت کرلیا کرتی ہے۔ ڈوما اور حکومتی سٹاف نے عدالت پر جرمنی کا خبط طاری کر لینے کا الزام عائد کیا۔ ان سب نے اپنے اتحادیوں سے ملاقات کی اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ فرانس نے اپنی فوج ہٹا کر ان کی جگہ روسی فوجی تعینات کر دیئے۔ برطانیہ نے بھی دھیرے دھیرے اپنی فوجیں میدان میں اتاریں۔ پیٹروگراڈ کے ڈرائنگ روموں اور محاذ جنگ کے ہیڈ کوارٹر میں ایک سنجیدہ مذاق عام ہو گیا کہ ''برطانویوں نے خون کے آخری قطرے تک لڑنے کی قسم اٹھائی ہوئی ہے لیکن یہ خون روسی فوجیوں کا ہو گا'' اوپر سے شروع ہونے والا یہ مذاق جلد ہی نیچے تک بھی سرایت کر گیا۔ ''سب کچھ جنگ کیلئے'' وزرا، نائب وزرا، کمانڈر، صحافی سب یہی نصیحتیں کرتے پھرتے تھے، سننے والا ہر فوجی یہی سوچتا تھا کہ ہاں یہ سب واقعی خون کے آخری قطرے تک لڑنا چاہتے ہیں... میرے خون کے آخری قطرے تک!

روسی فوج کو کسی بھی ہونے والی قومی جنگ میں شریک ہر فوج سے زیادہ جانی وجسمانی نقصان اٹھانا پڑا، لگ بھگ پچیس لاکھ ہلاکتیں ہوئیں جن میں سے 40% حصہ روسی فوج کا تھا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی روسی فوجیوں کو اندھا دھند فائرنگ کے تجربے سے گزرنا پڑا جس کا انہوں نے کبھی

تصور تک نہیں کیا تھا یا بہت ہی کم سوچا تھا۔لیکن دن بدن وہ تجربہ حاصل کرتے رہے ،اپنے کمانڈروں کی بے نیازی اور بے توجہی کے مارے چھوٹے رینک کے ان فوجیوں کیلئے یہ تجربہ بہت ہی تلخ ثابت ہوا۔وہ اپنے جرنیلوں کو پھٹے ہوئے جوتے پہنے ہر وقت پریشان ،حواس باختہ اور جوڑ توڑ میں مصروف دیکھتے رہتے تھے اتنا کہ ان کو اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کھانا بھی کھانا ہے۔خاک وخون میں غلطاں عوام اور صورتحال سے ایک ہی لفظ ''بیہودگی''زبان زدعام ہو گیا جو فوجی حلقوں میں پہنچ کر'' کچھ اور''معنی اختیار کر گیا۔

سب سے زیادہ تیز انتشار کسان فوجیوں میں دیکھنے آیا،ایک عمومی قانون کے طور پر،آرٹلری میں صنعتی مزدوروں کی شرح تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے،اسے باقی فوج کی نسبت انقلابی نظریات سے رغبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ 1905 کے واقعات اس کی واضح شہادت ہیں ۔جبکہ 1917 میں اس کے بالکل برعکس ہوا،آرٹلری نے انفنٹری کی نسبت زیادہ رجعتی کردار کا مظاہرہ کیا اور اس کی بھی ٹھوس مادی وجہ تھی کہ انفینٹری ڈویژنوں سے چھانٹی کے ذریعے انتہائی کم تربیت یافتہ فوجی اس میں کثیر تعداد میں شامل ہو چکے تھے تاہم جنگ میں اپنے نسبتاً کم نقصان کے باعث

آرٹلری میں اس کے زیادہ تر کیڈرز اب بھی موجود تھے۔ دیگر ہنر مند شعبوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ لیکن مجموعی طور پر آرٹلری نے بعد میں دیا بھی بہت کچھ تھا۔ گالیشیا کے محاذ سے شکست کے دوران کمانڈر انچیف کی طرف سے ایک خفیہ حکمنامہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ فوج سے بھاگنے اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو کوڑے مارے جائیں۔ ایک فوجی پائریکو لکھتا ہے ''انہوں نے معمولی سے معمولی غلطیوں پر بھی کوڑے مارنے شروع کر دیئے مثال کے طور پر اگر کوئی بغیر اطلاع کے ایک دو گھنٹے کیلئے ادھر ادھر چلا گیا، اور تو اور سپاہیوں کے جنگی مورال ان کی لڑنے کی صلاحیت اور جذبے میں اضافے کیلئے بھی ان کو سزائیں دی گئیں۔ 17 ستمبر 1915 کو کروپاٹکن نے گچکوف کے حوالے سے لکھا ''جنگ کی ابتدا میں چھوٹے رینک کے فوجیوں کا جوش و جذبہ مثالی تھا لیکن وہ جلد ہی بیزار اور دل گرفتہ ہو گئے۔ پے در پے ذلتوں اور شکستوں نے ان میں سے فتح کا اعتماد ہی مار ڈالا ہے'' اسی دوران وزیر داخلہ نے ماسکو میں موجود تیس ہزار تنومند فوجیوں پر طنز کرتے ہوئے بیان دیا ''یہ بدمزاج آوارہ گردوں کا ایک ایسا ہجوم ہے جسے نہ کسی ضابطے کی پرواہ ہے نہ ہی ان کو کوئی سلیقہ ہے، ان کا کام محض مٹر گشت کرنا اور پولیس سے پنگے لینا

ہے(کچھ ہی عرصہ پہلے ایک پولیس کا سپاہی فوجیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا) یہ گرفتار کئے گئے ملزموں کو چھڑواتے پھرتے ہیں ،وغیرہ وغیرہ۔اسی فوجی پائریکو نے لکھا ہے کہ ''بات دراصل یہ تھی کہ ہر ایک، چھوٹے بڑے سبھی جنگ چاہتے ہی نہیں،سب امن چاہتے ہیں! جنگ کون جیتے گا اور امن کیسا ہوگا،فوج کو اس سے کوئی سروکار تھا ہی نہیں! یہ بہرحال امن چاہتی تھی اسی لئے یہ جنگ سے بےزار تھی''

محاذ جنگ پر رضا کارانہ نرس کی خدمات سرانجام دینے والی ایک خاتون مبصر فیودورچینکوف نے محاذ پر مصروف فوجیوں کی سوچ، گفتگو کے بارے لکھا ہے جن سے اسے اپنے کام کے دوران آگاہی ہوئی تھی۔وہ اپنے کام کے دوران سب دیکھتی سنتی رہی اور اپنے تاثرات کو لکھتی رہی جسے بعدازاں اس نے ایک چھوٹی سی کتاب ''محاذ جنگ کے لوگ'' کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہمیں زندگی کی اس لیبارٹری کا مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے جس میں بم، زہریلی گیسیں،خاردار تاریں اور حکمرانوں کا حرامی پن ،کئی مہینوں تک لاکھوں روسی کسانوں کے شعور کی تراش خراش کرتے رہے،اور جہاں انسانوں کی ہڈیوں تک میں سرایت کرجانے والے تعصّبات مسلسل چیخ رہے تھے۔اس دوران فوجیوں کی طرف سے بنائی گئی کئی

خودساختہ کہاوتیں بعد میں ہونے والی خانہ جنگی میں نعروں کی شکل میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ دسمبر 1916 میں جنرل رسز کی نے شکایت کی کہ ''ریگا'' مشرقی محاذ پر ہماری بدقسمتی ثابت ہوا، یہاں پروپیگنڈے کا ایک جال بچھا تھا، یہی کیفیت ڈیونسک کی بھی ہے، جنرل بروسیلوف نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ ریگا پہنچنے والے فوجی قافلے دل شکستہ اور پژمردہ تھے، انہوں نے حملہ کرنے سے ہی انکار کر دیا، اپنے ایک کمپنی کمانڈر کو تو انہوں نے اپنی بندوقوں کی سنگینوں کی نوک پر ہی اٹھا لیا۔ چنانچہ ضروری ہو گیا تھا کہ کئی سپاہیوں کو سزا دی جائے چنانچہ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کئی ایک کو دوسری سزائیں دی گئیں۔ یوں ''فوج میں حتمی انتشار کی بنیادیں انقلاب سے بہت پہلے رکھی جا چکی تھیں'' یہ اعتراف فوجی حکام بالا کے ساتھ محاذ پر رہنے والے رڈزیانکو نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

انقلاب کے عناصر جو پہلے پہل منتشر تھے، یہ فوج کے اندر پوشیدہ تھے جن کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن انتہاؤں کو چھوتی بے چینی ان کو بعد ازاں نیچے سے ابھار کر سطح پر لے آئی۔ ہڑتالی ورکروں کو سزا کے طور پر محاذ جنگ پر بھیجنے کے عمل نے احتجاج کرنے والوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ کر دیا، شکست نے اس پر جلتی کا تیل کا کام کر دیا اور ہڑتال اور احتجاج کی

حمایت کو اور بھی بڑھا دیا۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کی رپورٹ کے مطابق ''فوج کے پچھلے اور محاذ والے حصوں میں ایسے کئی سرکش عناصر فروغ پا چکے ہیں جو آگے چل کر کسی بغاوت میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں جبکہ باقی فوج کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی بھی وقت حکم عدولی کر سکتی ہے''۔

اکتوبر 1916 میں، پیٹروگراڈ کی بری فوج کے صوبائی دفتر نے لینڈ کمیشن کے ایک نمائندے کی رپورٹ کی روشنی میں واضح لکھا ہے ''فوج میں جاری موڈ انتباہ کن اور خطرناک ہو چکا ہے، افسروں اور سپاہیوں میں تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ ان کے مابین کئی خونی تصادم بھی واقع ہو چکے ہیں۔ ہر جگہ ہر طرف ہزاروں کی تعداد میں فوجی بھگوڑے منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ جو شخص بھی کسی فوجی سے ملتا ہے اسے فوراً ہی پتہ چلتا ہے کہ فوج کتنی شکستہ اور زبوں حال ہو چکی ہے اور اس میں اخلاقی انتشار کتنا گہرا ہو چکا ہے!'' رپورٹ میں موجود انتباہی کیفیت کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ شاید اس صورتحال پر پر کسی کو اعتبار نہ آئے لیکن اس کی تصدیق ان ڈاکٹروں نے بھی کی ہے جو سرگرم محاذوں پر اپنی ڈیوٹیاں دے کر آئے ہیں وہ بھی یہی تاثر لے کر آئے ہیں، لہٰذا یہ رپورٹ مکمل طور پر قابل اعتماد ہے۔ جو موڈ محاذ پر موجود فوجیوں کا ہے وہی موڈ محاذ سے باہر فوجیوں کا بھی

ہے۔اکتوبر 1916میں کیڈٹ پارٹی کی کانگریس میں مندوبین کی اکثریت نے واضح طور پر یہ پوزیشن رکھی کہ سارے ملک خصوصاً دیہاتوں اورغریب شہری علاقوں میں کسی کو بھی جنگ میں کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا،شک اور عدم اعتماد نے سارے ملک کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔30اکتوبر1916 کوڈائریکٹر پولیس ڈیپارٹمنٹ نے اپنی ایک مختصر رپورٹ میں لکھا کہ کس طرح ہرطرف جنگ سے تھکاوٹ اور بے زاری اپنا اظہار کررہی ہے اور امن کی طلب خواہ وہ کسی طرح کسی شکل میں بھی ممکن ہو۔چند ہی مہینوں کے اندر یہ تمام حضرات وزراء، نائبین، پولیس، جرنیل، زمیندار، ڈاکٹر اور سابقہ فوجی افسران، ان تمام حضرات کو یہ خواب خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ انقلاب فوج کے اندر سے ''محبّ الوطنی'' کا خاتمہ کردے گا اور یہ بھی کہ بالشویک ان کے ہاتھوں سے اقتدار بآسانی چھین لیں گے۔

بلاشبہ فوج کی حب الوطنی کے بارے تمام تر گن گانے والے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بھی یہی آئینی جمہوریت پسند (کیڈٹ) ہی تھے۔لبرل ازم 1905میں ہی انقلاب کے ساتھ اپنے مشکوک رویے کی وجہ سے اپنا تعلق توڑ چکا تھا، اور اس نے ردانقلاب کے آغاز میں ہی سامراج کی جی حضوری کا پرچم بلند کرلیا تھا۔اور بات صرف یہیں تک نہیں رکی تھی، چونکہ یہ

ملک کو جاگیرداری کے جبڑوں سے نکالنے میں ناکام رہی تھی تاکہ سرمایہ داری کو ملک کی طاقتور پوزیشن پر لایا جاسکے،اس لئے اس نے بادشاہت اوراشرافیہ سے اپنے تعلقات قائم کر لئے تاکہ عالمی منڈی میں سرمائے کی برتر پوزیشن کو یقینی بنایا جاسکے۔اگر یہ سچ ہے کہ تباہی کا پھیلنا دنیا کے مختلف حصوں کا مقدر بن چکا تھا،تو یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ اس کے نتائج اس تباہی کا اہتمام کرنے والوں کے بس سے باہر ہو چکے تھے،اور یہ بھی شک وشبہ سے بالا ہو چکا تھا کہ روسی لبرل ازم جو کہ بادشاہت کی خارجہ پالیسی سے شدید متاثر تھا،اپنی تیاریوں میں کم ترین مرتبے کو بھی نہیں پاسکا۔1914 کی جنگ کو روسی بورژوازی نے اپنی جنگ سمجھ کر خوش آمدید کہا تھا۔26 جولائی 1914 کو ڈوما کے انتہائی خصوصی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیڈٹ پارٹی کے سربراہ نے کہا ”ہمارا کوئی مطالبہ کوئی شرط نہیں ہے ہم فقط اپنے دشمن پر اپنی فتح کی خوشخبری سننا چاہتے ہیں،اس کیلئے ہمیں اپنی تمام قوتیں پورے عزم وحوصلے سے بروئے کار لانی ہوں گی“ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر ملکوں کی طرح ،روس میں بھی قومی اتحاد سرکاری ضابطہ قرار پا گیا۔ماسکو میں ہونے والی ایک اعلیٰ ترین قومی تقریب میں عالی مرتبت بینکنڈ ارف نے تقریب میں موجود سفارتکاروں سے محاطب

ہوتے ہوئے فرمایا ’’وہ دیکھو، وہ رہا تمہارا انقلاب! جس کی برلن میں ہونے کی پیشین گوئی کی جا رہی تھی‘‘ فرانسیسی وزیر پالیولاگو کے الفاظ میں ’’اس وقت تمام لوگ ایک ہی سوچ سوچ رہے تھے‘‘ ایک ایسی صورتحال میں جب فریب خوردگی سے سخت گریز کرنا چاہئے تھا، یہ لوگ دھڑا دھڑ خوش فہمیاں پھیلائے چلے جا رہے تھے۔

انہیں اتنا ہوش اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ واقعات سے سنجیدہ نتائج اخذ کرتے۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی ایک جوشیلے توسیع پسند کیڈٹ، راڈیچوف نے جو کہ ایک وکیل اور جاگیردار تھا، اپنی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں دہاڑتے ہوئے کہا ’’کہیں ہم لوگ یہ آس تو نہیں لگائے بیٹھے کہ ان بیوقوفوں کے ذریعے ہم جنگ جیت جائیں گے؟‘‘ اور واقعات نے ثابت کیا کہ جنگ جیتنا بیوقوفوں کیلئے ممکن نہیں ہوا کرتا۔ لبرل ازم جو جنگ میں اپنی فتح کی امید سے مایوس حتیٰ کہ دستبردار ہو چکا تھا، نے کوششیں شروع کر دیں کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو کسی طرح واپس لے لیا جائے، انہوں نے شاہی حکومت پر مصالحت کر لینے کیلئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس مصالحت کیلئے ان کے پاس سب سے بڑا جواز جرمن پرستوں کی درباری پارٹی کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ تھا جو ان کے خیال میں خطرناک تھا

اور جو مصالحت کیلئے الگ سے کوششیں کر رہے تھے۔

1915 کی بہار میں جب بے ہتھیار روسی فوجی ہر محاذ پر سے شکست خوردگی کے داغ ماتھے پر سجائے پلٹ رہے تھے، حکومتی حلقے اپنے اتحادیوں کے صلاح مشورے سے یہ سنجیدہ فیصلہ کر چکے تھے کہ پرائیویٹ صنعت کو فوج کی ذمہ داری پر معاملات میں شامل کر کے میدان عمل میں لایا جائے۔ اس مقصد کیلئے خصوصی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں اعلیٰ حکام، بڑے صنعتکار شہروں دیہاتوں میں جنگ کے آغاز میں قائم ہونے والی دیہی و شہری یونینوں کے نمائندے اور 1915 میں ہی بننے والی فوجی صنعتی کمیٹیوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس روسی بورژوازی کیلئے طاقت اور اقتدار کے سرچشمے کے قریب پہنچنے اور اس سے فیضیاب ہونے کا باعث بن گئی۔ انہی تمام تنظیموں کی آشیرباد سے ریاستی ڈوما بھی بادشاہت اور بورژوازی کے مابین معاملات کو طے کرنے میں پر اعتماد اور سرگرم کوشش کرتی رہی۔

تاہم یہ تمام وسیع سیاسی تناظر بھی نیچے سماج میں موجود سلگتے دہکتے روز مرہ مسائل کا خاتمہ نہیں کر سکے۔ اس قسم کی خصوصی کانفرنسوں کے نتیجے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو، کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہروں کی طرح

سے،صنعتوں کی آبیاری کیلئے بھیجنا شروع کر دیا گیا،جس کی وجہ سے کئی صنعتوں نے نا قابل یقین منافعوں سے اپنے ہاتھ رنگ لئے۔ریاستی ڈوما اور اخبارات نے 1914/1915 کے دوران کمائے جانے والے جنگی منافعوں کی تفصیلات شائع کی تھیں جن کے مطابقماسکو کی ٹیکسٹائل کمپنی ریبوشنسکی کا نقد منافع 75%،Tver کمپنی کا 111%،تانبے کی کمپنی کالشوگن نے جس کی کل سرمایہ کاری ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی،ایک کروڑ بیس لاکھ کا نقد منافع کمایا،سماج کے ان شعبوں میں حب الوطنی کا اپنا ہی نرالا روپ رنگ تھا،اس کو پوری فیاضی سے نہ صرف نوازا گیا بلکہ پسینہ خشک ہونے سے بھی بہت پہلے اس حب الوطنی کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ مارکیٹ کو جوئے اور سٹے بازی کا جیسے شدید دورہ پڑ گیا تھا،کئی لوگوں نے کشت وخون کی اس ہولی سے راتوں رات اپنی قسمتیں سنوار لیں۔دارالحکومت میں ایندھن اور غذا سے محروم خلق خدا کی حالت زار نے بھی درباری صراف فابرگٹ کی تمکنت اور تکبر میں اضافے کو کم نہیں ہونے دیا کہ اس کے کاروبار نے کبھی بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی اس جنگ کے دوران ہوئی۔شہزادی وائیروبووا کے بقول ہم نے 1915/1916 میں جتنے اور جیسے ’’گاؤن‘‘ دیکھے اور پہنے ہیں اور جتنے ہیرے جواہرات خریدے

اور زیب تن کئے ہیں، پہلے کبھی نہیں کئے۔ تباہی و بربادی کے اس بدنصیب وقت میں ، نائٹ کلبوں کی رونقیں عروج پر پہنچ گئیں ، یہ ہمہ وقت قانونی بھگوڑوں ،فوجی ہیروؤں اور جنگ نہ لڑ سکنے والے معزز فوجی افسران سے لبالب بھرے رہتے تھے۔ بڑے نواب اور رؤسا بھی ملک وقوم پر آئے اس برے وقت کا غم غلط کرنے کیلئے اسی قسم کی محفلیں جمانے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے تھے سونے چاندی کی برسات کو رنگ ونور کی برسات سے ہم آہنگ کر دیا گیا۔

حصہ اول؛ زار کا زوال

باب سوم؛ پرولتاریہ اور کسان

روسی پرولتاریہ نے اپنا ابتدائی سبق ایک مطلق العنان حکومت کے پیدا کردہ سیاسی حالات سے سیکھا۔قانون کے مطابق ہڑتالوں ، زیرزمین میٹنگوں ، کھلے عام تقریروں ،مظاہروں ، پولیس فوج کے بارے گفتگو پر پابندی تھی۔ یہی وہ سکول تھا جو دھیرے دھیرے پنپتی سرمایہ داری اور ہولے ہولے گرتی لڑکھڑاتی مطلق العنانیت کے باہمی امتزاج نے تخلیق کیا تھا

۔دیوہیکل صنعتوں میں ورکروں کا شدید ارتکاز،حکومتی جبر وتشدد کے بڑھتے ہوئے کردار،اورسب سے بڑھ کر ایک نوجوان اور نوخیز پرولتاریہ کا بے صبراپن،اس سب نے ہڑتالوں کو روس کا روزمرہ کا معمول اور سیاسی جدوجہد کا مرکزی طریق کار بنادیا جبکہ یہ مظہر یورپ میں نہ ہونے کے برابر تھا۔موجودہ صدی کے آغاز سے اب تک کے ہڑتالوں کے اعدادوشمار دیکھے جائیں تو ہمیں روس میں سیاسی جدوجہد کی تاریخ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ہم یہاں 1903 سے 1917 کے عرصے میں روس میں ہونے والی سیاسی ہڑتالوں کی فہرست اپنے قارئین کے سامنے رکھنا چاہیں گے۔یہ اعدادوشمار اپنی کیفیت اورنوعیت میں کم سے کم ہیں اوران کا تعلق بڑے صنعتوں سے ہے۔ریلوے،کان کنی،مشینی اور چھوٹی صنعتوں اورخاص طور پرزراعت کے متعلق شعبوں کا اس فہرست میں ہم بوجوہ ذکرہی نہیں کررہے ہیں ۔لیکن اس عرصے میں ہونے والی ہڑتالوں میں ہونے والے اتارچڑھاؤ سے اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔یہ ہمارے سامنے ایک ایسا خاکہ ہے،اپنی نوعیت کا ایک اورواحد خاکہ جوایک قوم کے سیاسی ٹمپریچر کا پتہ دیتاہے اور جس کی کوکھ میں ایک عظیم انقلاب پرورش پارہاتھا۔ایک پسماندہ ملک جو اپنے اندر پرولتاریہ کی کم تعداد کا حامل

تھا، جہاں سارے ملک کے اندر 1905 میں صرف پندرہ لاکھ اور 1917 میں بیس لاکھ مزدور کام کرتے تھے وہاں ہڑتالی تحریکوں کے اس قدر رنگ روپ بنے کہ اب تک دنیا میں کہیں نہیں ہوئے تھے۔ پیٹی بورژوا جمہوریت کی کمزوری، کسان تحریک کی بے بصیرتی اور منتشر مزاجی کی موجودگی میں، محنت کشوں کی انقلابی ہڑتال ایک ایسا ہتھوڑا بن جایا کرتی ہے جو ایک بیدار ہوتی قوم کیلئے مطلق العنانیت کی دیواروں کو توڑنے کا اوزار ثابت ہوتی ہے۔ 1905 میں ہونے والی سیاسی ہڑتالوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد اٹھارہ لاکھ سے زیادہ 1,843,000 تھی، جبکہ ورکروں کی ان کی ہڑتالوں میں شرکت کی تعداد ان سے دوگنا تھی۔ ذیل میں دیے گئے اعداد و شمار کی مدد سے آپ بآسانی انقلابی سالوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں، چاہے آپ کو روسی سیاسی کیلنڈر سے شناسائی نہ بھی ہو!

سیاسی ہڑتالوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد (ہزاروں میں)

1903	87*
1904	25*
1905	1,843
1906	651

540	1907
93	1908
8	1909
4	1910
8	1911
550	1912
502	1913
1,059	1914 (first half)
156	1915
310	1916
575	1917 (January-February)

*The figures for 1903 and 1904 refer to all strikes, the economic undoubtedly predominating

(پہلے دونوں سالوں کے اعداد وشمار ہر قسم کی ہڑتالوں پر مشتمل ہیں، جو بلاشبہ معاشی زیادہ تھیں)

1904 میں ،جو روس جاپان جنگ کا پہلا سال تھا،فیکٹری معائنہ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ صرف پچیس ہزار ہڑتالی ریکارڈ پر آئے جبکہ 1905 میں سیاسی اور معاشی ہڑتالیوں کی تعداد 2,863,00 رہی جو پچھلے سال سے 115 گنا زیادہ تھی۔اس ایک شاندار حقیقت سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ واقعات کے تھپیڑوں سے لڑتا ہوا ایک پرولتاریہ، جس قسم کے شاندار ان دیکھے ان سنے انقلابی اقدامات کر جاتا ہے،ان سے لازمی کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی صورت ایک تنظیم کو ابھر کر سامنے آنا چاہئے!جو اس تمام تر جدوجہد کی تمام تر جہتوں اور کیفیتوں کو متحرک اور منظّم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہو!جی ہاں یہ تنظیم ’’سوویتوں‘‘ کی شکل میں موجود تھی جسے پہلے انقلاب نے جنم دیا تھا اور جو عام ہڑتال اور اقتدار کیلئے جدوجہد کا اوزار ثابت ہوئی۔دسمبر 1905 کی بغاوت میں شکست کے بعد کے دوسالوں کے دوران پرولتاریہ نے اپنی جیتی ہوئی پوزیشنوں کے دفاع کیلئے انتہائی شاندار جدوجہد کی لیکن یہ سال تنزلی کے سال تھے۔اس کے بعد آنے والے چار سال (1911-1908) ہماری ہڑتالی شماریات میں ردانقلاب کی فتح اور اس کے غلبے کے سال نظر آتے ہیں۔اسی عرصے میں ہونے والے صنعتی بحران نے جلتی پر تیل کا کام کرتے ہوئے تھکے ہارے پرولتاریہ کو اور بھی شل

کر ڈالا۔ یہاں ہمیں زوال کی کیفیت بھی اتنی شدید نظر آتی ہے جتنی عروج کی تھی۔ان سادہ اعداد وشمار سے ہی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واقعات نے سماج کو کس قدر ہلا کر رکھ دیا تھا۔1910 میں صنعتی عروج کی بحالی نے ایک بار پھر پرولتاریہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع فراہم کر دیا اور ان کی توانائی کو ایک نیا جوش وجذبہ عطا کر دیا۔ایک نئی اور تاریخی بنیاد کی وجہ سے اب کے بار ورکروں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اس بار ان کے پاس تجربہ بھی تھا۔ یہاں ہمیں ایک نیا انقلابی ابھار ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔1914 کی پہلی ششماہی کے دوران ہمیں سیاسی ہڑتالوں کی تعداد وہاں سے شروع ہوتی نظر آتی ہے جہاں یہ پہلے انقلابی سال کے عروج کے وقت تھی۔لیکن اس دوران جنگ چھڑ گئی اور اس نے سارے عمل کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔جنگ کے ابتدائی مہینے محنت کشوں کی سیاسی بے عملی کی نشاندہی کرتے ہیں۔تاہم 1915 کی بہار میں یہ بے عملی اور بے دلی ختم ہونا شروع ہو گئی تھی اور جدوجہد کی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔سیاسی ہڑتالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جو فروری 1917 میں ورکروں اور سپاہیوں کی سرکشی کی صورت میں عروج پر پہنچتا نظر آتا ہے۔

عوامی جدوجہد کے اتار چڑھاؤ نے چند ہی سالوں بعد روسی پرولتاریہ

کی شناخت تقریباً ختم ہی کر کے رکھ دی تھی، وہ فیکٹریاں جہاں دو تین سال پہلے تک کسی ایک معمولی پولیس ایکشن پر ہڑتال ہو جایا کرتی تھی، اپنا انقلابی رنگ روپ گنوا چکی تھیں اور اب وہاں انتظامیہ کی طرف سے کیا جانے والا ہر قسم کا جبر صبر و شکر کے ساتھ سہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ بڑی شکستیں عوام کو بڑے عرصے تک مایوسی اور بے دلی میں دھکیل دیا کرتی ہیں جبکہ باشعور انقلابی عناصر عوام پر اپنی سیاسی گرفت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ توہمات اور تعصّبات پھر سے زندگی کو اپنے غلبے میں لے لیا کرتے ہیں۔ دیہاتوں سے نقل مکانی کرنے والے بے شناخت افراد ایسے وقتوں میں محنت کشوں میں تحلیل ہو جایا کرتے ہیں، اور پھر شکوک و شبہات سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں، مایوس عناصر کو ایسے میں کچھ بھی ہوتا نظر آ رہا ہوتا۔ یہی 1907-11 کے دوران ہوا لیکن سالماتی عمل عوام کے اندر شکست کے نفسیاتی زخموں کو دھیرے دھیرے بھر رہا ہوتا ہے۔ واقعات کا ایک نیا سلسلہ یا یوں کہیے کہ تہہ میں پھلتی پھولتی معاشی بے چینی ایک نئے سیاسی ارتعاش کے امکانات کو سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے اور پھر جدوجہد ایک نئی شکتی و توانائی کے ساتھ اپنا آغاز کرتی ہے۔

روسی محنت کش طبقے میں موجود دو بڑے رجحانات کو سمجھنے کیلئے ہمیں یہ

لازمی طور پر ذہن رکھنا ہوگا کہ منشوازم نے بالآخر زوال اور ردعمل کی کیفیت میں ہی وجود پایا تھا۔اس کا بنیادی طور پر انحصار محنت کشوں کی ایک ایسی پرت پر تھا جو انقلاب سے ٹوٹ چکی تھی اور اس سے مایوس ہو چکی تھی، جبکہ بالشوازم جو ردانقلاب کے عہد میں بری طرح متاثر ہوکر منتشر ہو چکا تھا، نے جنگ سے پہلے کے سالوں میں ایک نئی انقلابی لہر کے ابھار کے ساتھ ہی دوبارہ ابھرنا شروع کیا تھا''انتہائی جراتمند اور توانا عناصر جوان تھک جدوجہد کیلئے تیار تھے، جو مزاحمت اور مسلسل منظّم ہونے کیلئے تیار تھے، یہ سب عناصر یہ سب تنظیمیں اور ایسے سارے لوگ لینن کے گرد جمع ہو چکے ہیں'' یہ الفاظ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ہیں اور ان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بالشویکوں نے جنگ کے سالوں کے دوران کس قدر جانفشانی سے کام کیا تھا!

جولائی 1914 میں جبکہ سفارتکار یورپ کے ہاتھوں اور پاؤں میں آخری کیل ٹھونکنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے، پیٹروگراڈ انقلابی تپش سے بھڑک اور ابل رہا تھا۔جمہوریہ فرانس کے صدر پاؤنکارے کو الیگزینڈر سوئم کی قبر پر پھول چڑھانے کیلئے جاتے ہوئے ایک عوامی مظاہرے میں پھنس کر حب الوطنی پر عوامی نعرے سننے پڑ گئے جن کی بازگشت اسے کافی فاصلے تک سنائی دیتی رہی تھی۔

کیا14-1912 کے دوران ہونے والے مشتعل عوامی مظاہرے زار شاہی کا خاتمہ کردیتے اگر جنگ نہ پھوٹ پڑتی ؟اس سوال کا حتمی جواب دینا ناممکن ہے لیکن اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو یہ عمل لامحالہ انقلاب کو جنم دیتا لیکن ان حالات میں انقلاب کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ؟ کیا اس کو ایک اور شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا؟ ورکرو ں کو کسانوں سے حمایت حاصل کرنے ،ان کو انقلاب کیلئے تیار کرنے اور فوج کو جیتنے کیلئے کتنا وقت درکار ہوتا؟ان تمام سوالوں کا جواب محض اندازوں سے ہی دیا جاسکتا ہے۔جنگ نے بہر حال پہلے پہل تحریک کو پست قدمی پر مجبور کردیا تھا لیکن جنگ کے بعد کے عرصے نے نہ صرف اسے تیزی بلکہ طاقت وتوانائی بھی بخشی بلکہ انقلاب کی عظیم الشان فتح کی ضمانت بھی فراہم کردی۔

جنگ کے نقارے پر پہلی ضرب پڑتے ہی انقلابی تحریک دم توڑ گئی ،ورکروں کی زیادہ جوشیلی اور سرگرم پرتوں کو متحرک کردیا گیا انقلابی عناصر کو فیکٹریوں سے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ہڑتال کا جرم کرنے پر سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ورکروں کے اشاعتی ادارے کو تہہ وبالا کردیا گیا۔ٹریڈ یونینوں کو پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ہزاروں لاکھوں عورتوں ،نوعمر لڑکوں اور کسانوں کو ورکشاپوں میں جبری بھرتی کرلیا گیا۔جنگ کی بین الاقوامی نوعیت نے

ورکروں کو سیاست سے دور اور بے نیاز کر دیا، جس کی وجہ سے فیکٹریوں کی انتظامیہ کو سر اٹھانے، مادر وطن کے نام پر من مانیاں کرنے، بڑی تعداد میں ورکروں کو محاذ پر روانہ کرنے اور ''دیکھو اور انتظار کرو'' کی بہادری اپنانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ انقلابی نظریات انتہائی چھوٹے اور خاموش حلقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ فیکٹریوں میں ان دنوں کسی کو بھی خود کو بالشویک کہلانے کی توفیق نہیں ہوتی تھی، یہ صرف گرفتاریوں کے خوف سے ہی نہیں تھا بلکہ پسماندہ ورکروں کی طرف سے تشدد اور مارے جانے کی وجہ سے بھی تھا۔

ڈوما میں بالشویکوں کا دھڑا اپنے ارکان کی کمزوری کے باعث جنگ کی ابتدا کے موقع پر اپنے فرائض منصبی کی بھرپور ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ اپنے منشویک نائبین کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ ''عوام کے ثقافتی ورثے کا ہر قسم کے اور ہر نوعیت کے حملوں سے تحفظ کیا جائے گا'' ڈوما میں اس مصالحانہ پوزیشن کے اختیار جانے پر جوش وخروش سے تالیاں بجائی گئیں۔ پارٹی کی کسی بھی تنظیم یا گروپ کو وہ بے باک پوزیشن اختیار کرنے کی جرات اور توفیق نہ ہو سکی جو لینن نے غیر ملک میں بیٹھ کر لی تھی۔ تاہم بالشویکوں میں ''محبّ

الوطن‘‘ عناصر کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔نردونکوں*(ا) اور منشویکوں کے برعکس ،بالشویکوں نے 1914 میں عوام میں تحریری اور زبانی طور پر جنگ کے خلاف احتجاجی پوزیشن رکھنی شروع کردی تھی۔ڈوما کے بالشویک ارکان نے جلدہی اپنی کمزوری پر قابو پاتے ہوئے انقلابی کام شروع کردیا۔ایک اعلیٰ ترقی یافتہ اشتعال انگیز نظام کی وجہ سے حکام اس سب سے اچھی طرح باخبر ہورہے تھے۔یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ پارٹی کی پیٹرزبرگ کمیٹی کے سات میں سے تین ممبر،جنگ کے موقع پر سیکرٹ سروس کی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔زارشاہی کسی اندھے کی طرح انقلاب کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔نومبر میں بالشویک نائبین کو گرفتار کرلیا گیاجس پر پارٹی نے پورے ملک میں ہنگامہ برپا کردیا۔فروری 1915 میں ڈوما کے دھڑے کا مقدمہ عدالتوں میں پیش کردیا گیا۔نائبین صورتحال سے احتیاط سے نبرد آزما ہوئے۔کامینیف ،دھڑے کا نظریاتی قائدلینن کی بے باک پوزیشن سے منحرف ہوگیا،یہی یوکرائین کی موجودہ مرکزی کمیٹی کے آج کل کے سربراہ پیٹروسکی نے کیا۔پولیس ڈیپارٹمنٹ کافی مطمئن تھا کہ نائبین کے بیانات میں ایسی کوئی خطرناک بات نہیں تھی جس سے ورکروں میں اشتعال پھیل جاتااوران کو

احتجاج کیلئے بھڑکا سکتا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ جنگ نے ایک نیا اور تروتازہ محنت کش طبقہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی تھی۔ پیٹروگراڈ میں محنت کرنے والوں میں سے 40% نئے لوگ تھے۔ انقلابی تسلسل کئی جگوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ بالشویکوں کے ڈوما کے دھڑے سمیت جو کچھ بھی جنگ سے قبل موجود تھا، وہ سب اچانک ہی تھک ہار کر کہیں گم ہو چکا تھا اور کسی ایسے پس منظر میں چلا گیا تھا کہ جہاں سے اس کی کوئی سدھ بدھ نہیں ہو سکی! لیکن خاموشی اور محبّ الوطنی کے اس نقاب کے پیچھے سے، یہاں تک کہ کسی حد تک بادشاہت کے اپنے اندر سے، نئے سماجی دھماکوں کے آثار بتدریج عوام میں سرایت کرتے جا رہے تھے۔

اگست 1915 میں زارشاہی کے وزراء ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ ''ورکر ہر جگہ جرمنوں کے کہنے پر کی جانے والی سازشوں، غداریوں اور سبوتاژ کی وجوہات کو کھوج رہے ہیں اور وہ جوش وجذبے سے ان روس کی شکست کا باعث بننے والے گنہگاروں کو تلاش کر رہے ہیں'' یہ درست ہے کہ ان دنوں عوام کا بیدار تنقیدی شعور کافی حد تک اخلاص اور دفاع کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور مادر وطن کے دفاع کا نکتہ نظر اپنائے ہوئے تھا۔ ورکروں

کی یہ بے چینی مسلسل گہری ہوتی چلی جارہی تھی،اس بے چینی نے آقاؤں پر چپ طاری کردی تھی۔ بلیک ہنڈرڈز کے ورکرز جو انتظامیہ کے خدمتگار تھے ایسا ماحول پیدا کررہے تھے کہ جس کی وجہ سے بالشویک ورکروں کوسر اٹھانے کا موقع مل رہا تھا۔

تنقید اور نکتہ چینی سے بلند ہو کر عوام اب عمل میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ان کے اضطراب نے اپنا پہلا اظہار غذائی قلت پر کیا اور بسا اوقات یہ لڑائی جھگڑے فسادات کی شکل اختیار کر جاتے تھے۔عورتیں بوڑھے اور نوجوان بیرکوں میں فوجیوں اور فیکٹریوں میں ورکروں کی نسبت زیادہ آزادی جرات اور غم وغصے کا مظاہرہ کررہے تھے۔مئی میں ماسکو میں ہونے والے مظاہرے جرمنوں کے قتل عام میں تبدیل ہو گئے اگرچہ اس میں شریک تمام افراد پولیس کے پروردہ غنڈوں کے گروہ تھے۔تاہم ماسکو کے صنعتی علاقے میں پیدا ہونے والی یہ صورتحال ظاہر کرتی ہے کہ ورکرز ابھی تک اتنے باشعور نہیں ہوئے تھے کہ وہ ان فساد زدہ چھوٹے علاقوں میں اپنا پروگرام اور اپنا اثر ورسوخ قائم کرسکیں۔غذائی ضروریات پر ہونے والے یہ فسادات سارے ملک میں پھیل گئے،انہوں نے جنگی جنون کا خاتمہ کردیا اور سڑکوں گلیوں کو ہڑتالوں مظاہروں سے بھردیا۔

فیکٹریوں میں خام مزدوروں کی بہتات اور جنگ سے کمائے جانے والے منافعوں کی ہوس نے ہر جگہ حالات کار میں کمی پیدا کر کے بدترین استحصال کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ زندہ رہنے کے اخراجات میں اضافے نے خود بخود اجرتوں میں کمی پیدا کر دی جس کا ناگزیر نتیجہ عوام کی معاشی ہڑتالوں اور مظاہروں کی صورت میں نکلنا تھا ان کو جتنا روکنے کی کوشش کی جاتی یہ اور بھی بھڑک اٹھتے تھے۔ یہ ہڑتالیں، میٹنگوں کے بعد کی جاتی تھیں اور ان میں سیاسی قراردادیں منظور کی جاتی تھیں، عوام کی پولیس سے جھڑپیں ہوتیں اور ان میں گولیاں تک بھی چل جاتی تھیں اور جانی نقصان بھی ہوتا تھا۔ جدوجہد کا زیادہ تر اظہار ٹیکسٹائل کے علاقے میں تھا، 5 جون کو پولیس نے کوستروما میں کھڈی بانوں کی ریلی پر گولی چلا دی جس سے چار مزدور ہلاک اور نو زخمی ہو گئے۔ دس اگست کو ایوانوف-ووزنیسینسک میں فوج نے ورکروں پر فائرنگ کر کے سولہ مزدور ہلاک اور تیس زخمی کر دیے۔ ٹیکسٹائل ورکروں کی تحریک میں مقامی بٹالین کے کچھ سپاہی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایوانوف والے واقعے کے ردعمل میں سارے ملک میں مظاہرے ہوئے۔ اسی سے ملتی جلتی کیفیت معاشی جدوجہد کی بھی تھی۔ ٹیکسٹائل ورکر اکثر پیش قدمی کرتے ہوئے جرات سے مارچ کرتے تھے۔

1914 کی پہلی ششماہی سے موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تحریک اپنے مطالبات ومقاصد کے اعتبار سے نظریاتی صراحت اور دباؤ سے محرومی کے باعث ایک بڑی پست قدمی تھی ۔اور یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی! جب بھی عوام کی اکثریت خام کیفیت میں جدوجہد میں اترتی ہے اور جب یہ رہنمائی کرنے والے کارکنوں سے مکمل طور پر جڑی ہوئی نہ ہوتو ایسا ہوتا ہے۔تاہم ان ابتدائی مظاہروں میں بھی اتنی گھن گرج موجود تھی کہ ان کی گونج نے حکمرانوں کے ایوانوں کو بھی ہلا دیا تھا۔وزیر انصاف خووستوف نے 16 اگست کو کہا ''اگر ان دنوں ورکروں کے مسلح مظاہرے نہیں ہورہے ہیں تواس کی ایک ہی وجہ ہے کہ یہ منظّم نہیں ہیں'' یہاں تک کہ خود گورمیکن نے بھی اعتراف کیا کہ ''ورکروں کی قیادت کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ وہ تنظیم سے محروم ہو چکے ہیں جو ڈوما میں ان کے پانچ ارکان کی گرفتاری کے بعد سے منتشر ہو چکی ہے''۔وزیر داخلہ نے بھی ایسا ہی بیان دیا ''ہمیں ڈوما کے بالشویک ارکان پر کوئی ترس نہیں کھانا ہے کہ یہی وہ منظّم ہیں جو تحریک کو خطرناک بنائے ہوئے ہیں'' اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے دشمن کو پہچاننے اور اس کا مقابلہ کرنے میں کم از کم کوئی غلطی نہیں کی تھی! جبکہ وزارت بھی، ایک ایسے ماحول میں جب کہ وہ انتہائی

سراسیمگی کی کیفیت میں تھی اور لبرلز کو رعایتیں دینے پر آمادہ ہو چکی تھی، وہ بھی ورکروں کے انقلاب کر دینے سے سہمی ہوئی تھی اور وہ بھی بالشویکوں سے خاص طور پر! بڑے سرمایہ دار کوشش کر رہے تھے کہ وہ منشویکوں کے ساتھ اپنے تعلقات مستحکم کر لیں۔ ہڑتالی تحریک کے اندیشے سے خوفزدہ لبرل صنعتکاروں نے کوشش کی کہ وہ فوجی صنعتی کمیٹیوں کے سٹاف میں اپنے نمائندے منتخب کرا کے ورکروں پر حب الوطنی پر مبنی ڈسپلن مسلط کریں۔ وزیرداخلہ نے شکایت کی کہ گچکوف کی پیش کردہ اس تجویز پر عملدرآمد بہت ہی مشکل ہے، یہ سب حب الوطنی اور دفاعی مفادات کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی ہم یہاں یہ بتانا چاہیں گے کہ پولیس نے ان سماجی محبّ الوطنوں کو ہڑتالوں اور انقلابی سرگرمیوں کے خلاف جدوجہد میں سرکار کا ہمنوا و مددگار سمجھتے ہوئے گرفتار کرنے سے گریز کئے رکھا۔ ان کو اس قسم کے محبّ الوطن سوشلزم پر اتنا بھروسہ اور اعتماد تھا کہ سیکرٹ سروس نے تو یہ طے ہی کر لیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد کسی قسم کے انقلاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فوجی صنعتی کمیٹیوں کے الیکشن میں ایک جوشیلے مخلص میٹل ورکر گوزدیف کی قیادت کے تحت (جو انقلاب کے بعد قائم ہونے والی مخلوط حکومت میں

وزیر محنت بنا تھا، اس کے بارے میں ہم آگے چل کر بات کریں گے) دفاع پرست اقلیت میں آ گئے، تاہم یہ لبرل بورژوازی اور افسر شاہی کی حمایت سے فیضیاب ہوتے رہے، ان سے بہتر مراعات حاصل کرتے رہے جن کی قیادت بالشویک کر رہے تھے اور جو کمیٹیوں کے بائیکاٹ کے خواہشمند تھے۔ یہ لوگ ''صنعتی حب الوطنی'' کے ان مراکز کے اندر اپنی نمائندگی ٹھونسنے میں کامیاب رہے جو پیٹرز برگ کی پرولتاریہ پر مسلط کی گئی۔ مینشویکوں کی پوزیشن کا اظہار ان کے نمائندوں کی ان تقریروں سے ہوتا تھا جو بعد میں کمیٹی کے ایک اجلاس میں کی گئی تھیں اور جن میں صنعتکاروں سے کہا گیا تھا کہ '' آپ لوگوں کو یہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ موجودہ افسر شاہی کو ریٹائر کر دیا جانا چاہئے اور ان کی جگہ آپ لوگوں کو آ جانا چاہئے کیونکہ آپ ہی موجودہ سماجی ڈھانچے کی سچی نمائندگی کرتے ہیں'' یہ تازہ دم تعلقات لمحہ بہ لمحہ تیزی سے پھل پھول رہے تھے۔ انقلاب کے بعد یہ تعلقات بارآور ثابت ہوئے۔

جنگ نے زیر زمین تحریک کو اجاڑ کر اسے غمگین اور نا امید کر کے رکھ دیا، ڈوما میں بالشویک دھڑے کی گرفتاری کے بعد بالشویکوں کے پاس کوئی بھی منظّم پارٹی نہیں رہی تھی۔ مقامی کمیٹیوں کی حیثیت ضمنی تھی اور وہ ورکروں

کی کمیٹیوں سے اس قدر جڑی ہوئی بھی نہیں تھیں ،محض ڈار سے بچھڑے پرندوں کی طرح کے کچھ گروپ، حلقے اورافرادہی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔تاہم دوبارہ سراٹھاتی پھیلتی ہڑتالی تحریک نے انہیں فیکٹریوں میں ایک نئی شکتی اور کچھ حوصلہ فراہم کردیا۔رفتہ رفتہ انہوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈنااورملنا شروع کردیا اور یوں رابطے بحال و مستحکم ہونے شروع ہوگئے۔زیر زمین کام کو ایک نئی زندگی مل گئی،بعد کی لکھی گئی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق''جنگ چھڑنے کے فوری بعد سے ہی لیننسٹوں نے جن کوسوشل ڈیموکریٹک تنظیموں کےاندرزیرزمین کام کے حوالے سے انتہائی غیرمعمولی اکثریت حاصل تھی،اوروہ بھی ان کے بڑے مراکز مثلاً پیٹروگراڈ،ماسکو،خارکوف،کیف ،تولا،کوسترما،صوبہ ولادیمیر اورسمارا میں،جہاں وہ جنگ کو روکنے ،حکومت کا تختہ الٹ دینے اور ایک عوامی حکومت قائم کرنے کی انتہائی موثر اپیلیں کررہے تھےاوران اپیلوں نے ورکروں کی ہڑتالوں اورمظاہروں کے وقوع پذیرہونے میں انتہائی اہم کرداراداکیاتھا''۔

ونٹرپیلس کی طرف ورکروں کا روایتی مارچ جوپچھلے سال کچھ کئے بغیر گذرگیاتھا،اب کی بار9جنوری 1916 کوایک وسیع ہڑتال کی صورت

اختیار کر گیا۔اس سال ہڑتالی تحریک کے زور میں دگنا اضافہ ہو گیا۔ پولیس کی طرف سے کی جانے والی مزاحمتیں ان کی شدت اور کیفیت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں، سپاہیوں کے ساتھ اپنے رویے میں ورکر انتہائی دوستانہ ہو جاتے تھے،اور یہ بات سیکرٹ سروس والوں کو غیر معمولی بھی لگتی تھی اور کھٹکتی بھی تھی!

جنگی صنعت اپنی بساط اور اوقات سے زیادہ کام اور کمائی کی وجہ سے، تمام تر وسائل اپنے اندر ہڑپ کرنے کے باعث اتنی بھاری بھرکم ہو چکی تھی کہ اپنے ہی بوجھ تلے دبنا شروع ہو چکی تھی۔امن کے دور میں رواں دواں رہنے والے پیداواری یونٹ مرنا شروع ہو گئے۔تمام تر منصوبہ بندی کے باوجود صنعت کو باقاعدہ کئے جانے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکا۔طاقتور فوجی صنعتی کمیٹیوں کی مخالفت کے باوجود افسر شاہی اس قابل ہی نہیں تھی کہ وہ صنعت اور اس سے متعلقہ امور کو بہ احسن چلا سکتی، بلکہ اس نے ان صنعتوں کے بورژوازی کے ذریعے چلائے جانے کیلئے قوانین بدلنے سے بھی انکار کر دیا جس کی وجہ سے انتشار شدید ہوتا چلا گیا۔ ہنر مندوں کی جگہ غیر ہنر مند کام پر لگا دیے گئے۔ پولینڈ کی کوئلے کی کانیں اور فیکٹریاں جلد ہی جواب دے گئیں۔ جنگ کے پہلے ہی سال کے

اندر اندر کل قومی صنعت کا پانچواں حصہ بند ہو چکا تھا، 50% سے زیادہ قومی پیداوار فوجی اور جنگی ضروریات پوری کرنے پر لگ رہی تھیں، ان میں صرف ٹیکسٹائل کی مصنوعات 75% تھیں۔ اوورلوڈ ہو چکی ٹرانسپورٹ بہت جلد فیکٹریوں کو درکار لازمی ایندھن اور خام مال کی ترسیل پہنچانے کے قابل نہیں رہ سکی۔ جنگ نہ صرف قومی آمدنی کو تیزی سے ہڑپ کرنے لگ گئی تھی بلکہ اس نے ملک کے بنیادی خزانے کو بھی شدت سے خالی کرنا شروع کر دیا تھا۔

صنعتکار اپنے ورکروں کو کم سے کم دینے پر آ گئے تھے جبکہ حکومت حسب روایت اس زیادتی کے خلاف ہڑتال یا مظاہرے کو سختی سے کچلنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کیفیت نے ورکروں کو خاص کی بجائے عام کے بارے یعنی معیشت کی بجائے سیاست پر سوچنا شروع کر دیا۔ ان میں یہ سوچ پروان چڑھ گئی کہ "ہم سب کو مل کر ایک ہو کر ہڑتال کرنی ہوگی"۔ اسی سے عام ہڑتال کا نظریے نے فروغ پایا۔ عوام کی ریڈیکلائزیشن کا عمل اپنا فی البدیہہ اظہار ہڑتال کے طور طریقوں میں کرتا ہے۔ 1915 میں ورکروں کی سیاسی ہڑتالوں میں شرکت معاشی ہڑتالوں میں شمولیت دو کے مقابلے میں آدھی تھی۔ پیٹروگراڈ کا کردار ایک ہی تذکرے میں واضح ہو جاتا ہے؛ ہڑتالی ورکروں کا 72% جنگ کے سالوں کے دوران بے حس و حرکت

ہو چکا تھا۔

اس جدوجہد کی تپش نے کئی قدیم عقیدوں کو راکھ میں بدل کے رکھ دیا تھا۔سیکرٹ سروس انتہائی کرب انگیز انداز میں لکھتی ہے کہ'' قانون پر عملدرآمد کے ضمن میں وہ ایسے گستاخانہ طریقے سے پیش آتے ہیں کہ جس سے معزز ومحترم افسران کا تقدس اور احترام ہی مجروح ہو جاتا ہے ،دفعہ 103 جو توہین عدالت کے کیسوں پر عائد ہوتی ہے، کے حوالے سے درج ہونے والے مقدمات کی تعداد اتنی زیادہ ہوچکی ہے کہ ان کا شمار ہی نہیں کیا جاسکتا ہے''۔تاہم عوام کا شعور ان کے عمل سے کہیں زیادہ پچھڑا ہوا ہوتا ہے۔جنگ کا بڑھتا ہوا خوفناک دباؤ اور قومی تباہی جدوجہد کے عمل کو مزید تیز کر دیتا ہے لیکن محنت کش عوام کی وسیع پرتیں،انقلاب برپا ہونے تک ہر اس تعصب وتقدس کو عمومی طور پر اپنائے رکھتی ہیں اور ان سے جان نہیں چھڑوا پاتیں جنہیں وہ اپنے ساتھ دیہات سے یا قصبات کے پیٹی بورژوازی خاندانوں سے لائے ہوتے ہیں، یہ حقیقت اپنے اثرات ہمیں فروری کے پہلے انقلاب میں مرتب کرتی دکھائی دیتی ہے۔

1916 کے آخر تک اشیائے زندگی کی قیمتیں آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگ گئی تھیں۔افراط زر اور ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی نے اشیائے

زندگی کی قلت میں تو اور بھی بدترین اضافہ کر دیا تھا۔ آبادی کی ضرورتوں میں نصف سے زیادہ کمی واقع ہو چکی تھی، جس نے مزدور تحریک کو بھڑکا کے رکھ دیا۔ اکتوبر میں جدوجہد فیصلہ کن کیفیت میں داخل ہو جاتی ہے اور سبھی منتشر عناصر کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ پیٹروگراڈ فروری کی جست سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ فیکٹریوں کے اندر میٹنگوں کی لہر چلنی شروع ہو جاتی ہے جن کے موضوعات خوراک کی فراہمی، معیار زندگی کی گراوٹ، جنگ اور حکومت ہوتے تھے۔ بالشویکوں کے لیفلیٹ جگہ جگہ تقسیم ہو رہے تھے، سیاسی ہڑتالیں شروع ہو جاتی ہیں، فیکٹریوں کے گیٹ مظاہروں سے بارونق ہو رہے تھے۔ ایسی فیکٹریوں میں مزدوروں اور سپاہیوں کے مابین تعلقات پھلتے پھولتے جا رہے تھے۔ بالٹک بحری بیڑے کے انقلابی جہازیوں کے خلاف مقدمے کے معاملے پر اشتعال انگیز ہڑتالی تحریک پھوٹ پڑی۔ فرانسیسی سفیر نے وزیراعظم سٹرومر کی توجہ اس واقعے کی طرف مبذول کرائی جس میں کچھ فوجیوں نے پولیس پر فائرنگ کر دی تھی۔ وزیراعظم نے سفیر کو یہ کہہ کر چپ کرا دی کہ'' ہم ایسے پر تشدد واقعات کرتے رہیں گے''۔ نومبر میں فوجی ڈیوٹیاں دینے والے مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو پیٹروگراڈ میں کام سے فارغ کر کے محاذ جنگ پر روانہ کر دیا گیا۔ اس

سال کا اختتام نہایت طوفانی اور ہلا دینے والا ثابت ہوا۔

اس کیفیت کا 1905 کی صورتحال سے موازنہ کرتے ہوئے پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ویسلیف یہ تکلیف دہ نتیجہ نکالتا ہے؛اپوزیشن اپنے موڈ میں بہت ہی آگے نکل چکی ہے، یہ 1905 سے بھی کہیں زیادہ آگے کی کیفیت ہے،عوام میں بے چینی اور سرگرمی آج کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی''۔ویسلیف کو چھاؤنیوں سے کسی بھی قسم کی توقع نہیں تھی، یہاں تک کہ اسے اپنے پولیس افسروں پر بھی کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا۔انٹیلی جنس سروس ایک عام ہڑتال کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھتی ہے کہ اس سے ایک دہشت گرد قسم کی بغاوت کا خطرہ جنم لے سکتا ہے۔''پتہ نہیں ہم کس بات کا انتظار کر رہے ہیں !ایسے لوگوں کے خلاف کاروائی کیوں نہیں کی جاتی!ان سرکش لوگوں کا سر کچل کیوں نہیں دیا جاتا؟ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم کوئی وقت ضائع کئے بغیر بہت کچھ کر گزرتے (وغیرہ وغیرہ)''۔بالشویک سنٹرل کمیٹی کے رکن شلیاپنیکوف جو کہ خود بھی ایک سابق میٹل ورکر تھا،ان دنوں ورکروں کی ذہنی کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے''محض ایک سیٹی کی آواز یا پھر معمولی سا شور بھی ورکروں کیلئے سگنل کی حیثیت رکھتا تھا اور کام روک دیا جاتا تھا'' یہ بات نہ صرف سیاسی علامت کے طور پر بلکہ ایک نفسیاتی حقیقت

کے طور پر بھی بالکل درست ہے کہ انقلاب ہمیشہ پہلے آپ کے رگ و پے میں سرایت کرتا ہے تب یہ گلیوں سڑکوں چوراہوں پر اپنا اظہار کیا کرتا ہے۔

دوسرے تمام علاقے بھی دھیرے دھیرے ایسے ہی مراحل سے گذر رہے تھے۔تحریک کی عوامیت اور جنگوئی میں اضافہ اپنی مرکزیت کے مراکز بدلتا رہا اور ٹیکسٹائل سے میٹل کے مزدوروں کی طرف تبدیل ہوتا رہا، معاشی ہڑتالیں سیاسی ہڑتالوں میں بدلتی رہیں اور چھوٹے علاقوں سے پیٹروگراڈ منتقل ہوتی رہیں۔ 1917 کے پہلے دو مہینوں میں 575,000 ہڑتالیوں کی تعداد ریکارڈ کی گئی جس کا بڑا حصہ دارالحکومت میں تھا۔پولیس کی طرف سے مارے جانے والے چھاپوں کی مہم کے باوجود 9 جنوری کو ڈیڑھ لاکھ مزدوروں نے خونی سالگرہ کے موقع پر ہڑتال کی اور مظاہرہ کیا۔ہڑتالیوں کا موڈ انتہائی جوشیلا تھا جن کی قیادت میٹل ورکر کر رہے تھے۔سبھی کو محسوس ہو گیا تھا کہ واپسی کا اب کوئی رستہ نہیں رہا ہے۔ہر فیکٹری کے اندر، تقریباً ہر جگہ بالشویکوں کے گرد ایک سرگرم مرکز قائم ہو چکا تھا۔فروری کے پہلے دو ہفتوں کے دوران میٹنگیں اور ہڑتالیں مسلسل ہوتی رہیں ۔8 فروری کو پوٹیلوف فیکٹری میں پولیس کا مار مار کر بھرکس نکال دیا گیا جبکہ 14 فروری کو جب ڈوما کا اجلاس شروع ہو

رہا تھا، 90 ہزار ورکروں نے پیٹروگراڈ میں ہڑتال کردی۔ ماسکو میں بھی کئی پلانٹ بند ہو گئے۔ 16 فروری کو انتظامیہ نے پیٹروگراڈ میں ''روٹی کارڈ'' متعارف کرادیے۔ اس انفرادیت نے جذبات کو اور بھی بھڑکا دیا اور 19 فروری کو عوام کے جھنڈ جن میں زیادہ تر خواتین شامل تھیں، خوراک کی دکانوں پر جمع ہو گئے جو روٹی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک دن بعد ہی تمام بیکریاں بند کردی گئیں، یہ وہ گرما گرم ماحول تھا جس کی تپش میں انقلاب کا شعلہ پک رہا تھا اور جو کچھ ہی دنوں کے اندر بھڑکنے والا تھا۔

****

روسی پرولتاریہ نے اپنی انقلابی بے باکی محض خود اپنے اندر سے ہی نہیں دریافت کی تھی، ساری آبادی میں اقلیتی حصہ ہونے کی بنا پر یہ کبھی بھی اپنے اندر اقتدار حاصل کرنا تو کجا، اتنی جدوجہد کی جرات نہیں کرسکتا تھا اگر اسے عوام کی وسیع پرتوں میں اپنی حمایت کی مضبوط بنیادیں قائم نہ کرتا۔ ایسی ہی ایک حمایت کی ضمانت اسے زرعی مسئلے پر بھی حاصل ہوئی تھی۔ 1861 میں انتہائی تاخیر سے کسانوں کو ملنے والی نیم دلانہ آزادی نے بھی زرعی صنعت کو جدید بنانے میں کوئی مدد نہیں دی تھی بلکہ اس کی

کیفیت دوسوسال پہلے والی ہی تھی۔مشترک زمین پر مشتمل قدیم قطعات اراضی کو آباد کرنے کیلئے جو اصلاحات کے ذریعے حاصل کئے گئے تھے،کاشتکاری کے جو طریقے مروج تھے وہ صدیوں پرانے تھے ،اس پر دیہاتوں میں بڑھتی آبادی نے وہاں کی زندگی کومزید اجیرن بنادیا تھا جو پہلے ہی کئی سطحوں پر بحرانوں کی زد میں تھی۔کسان، پسماندگی اور جدت کی مشترکہ تیار کردہ دلدل میں بری طرح دھنستے چلے جارہے تھے، وہ انیسویں صدی میں بھی سترہویں صدی میں رہ رہے تھے۔ایک ایسی جدید سرمائے پر مبنی معیشت جس کی ضروریات صرف ٹریکٹروں سے پوری کی جاسکتی تھیں،اس کیلئے لکڑی کے ہل استعمال ہورہے تھے۔یہاں بھی ہم تاریخی عمل کی دو الگ الگ کیفیتوں کوایک ہی منظر میں شکل پاتے ہوئے دیکھتے ہیں جواپنے اندر شدیدترین تضادات کو پیدا کرتا اور ان کومسلسل بھڑکاتا ہوا نظر آتا ہے۔ زراعت اور معاشیات کے ماہرین کا کہنا تھا کہ ہمارے پاس جو زرخیز زمین پہلے سے موجود ہے وہ کافی سے بھی زیادہ ہے، دوسرے لفظوں میں کسانوں سے کہا جارہا تھا کہ وہ ایک بڑی چھلانگ لگاتے ہوئے نئی تکنیک پر عملدرآمد شروع کردیں اوراس سے پیدا ہونے والے نئے ماحول اور ثقافت کواپنالیں ، وہ بھی جاگیرداری، نمبرداری اور بادشاہت کو کچھ کہے بغیر!لیکن کوئی بھی

نظام معیشت اور خاص طور پر ایک زرعی معیشت پر مبنی حکومت کا، جو انتہائی پچھڑی ہوئی بھی ہو، اپنے امکانات اور ضروریات کے آگے قائم رہنا محال ہو جاتا ہے۔ ایک نئے اور تند و تیز معاشی کلچر کی طرف دھکیلے جانے سے قبل کسان کو اپنے تین شعبوں کو وسعت دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب زمین ''بے کسان'' کر دی جائے۔ اپنے چھوٹے سے قطعہ اراضی کی تنگی اور تنگدستی میں گزر بسر کرتے، منڈی اور سرمائے کے کوڑوں کی سزا سہتے نحیف و نزار روسی کسان کیلئے ناگزیر ہو چکا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً ایک بار جاگیرداری کو ہر حال میں ہمیشہ کیلئے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرے۔

پہلے انقلاب کے وقت صرف یورپی روس میں زرخیز زمین کا کل حجم تقریباً 2800 لاکھ ڈسیاٹن *(۲) تھا، جبکہ مشترکہ الاٹمنٹ پر مشتمل رقبہ اس سے نصف تھا۔ شاہی خاندان کے زیر تصرف رقبہ 1400 لاکھ ڈسیاٹن تھا اور چرچ و پادریوں کے پاس 50 لاکھ ڈسیاٹن سے زیادہ رقبہ تھا۔ نجی طور پ700 لاکھ ڈسیاٹن رقبہ تیس ہزار بڑے زمینداروں کے پاس تھا ان میں سے ہر ایک 500 ڈسیاٹن تک کا تو بہر حال مالک تھا۔ اس آخری الذکر رقبے کو کسان خاندانوں کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ مذکورہ بالا زمینی

اعداد وشمار کسان جدوجہد کے کسی ٹھوس پروگرام کا تقاضا کرتے ہیں! پہلے انقلاب کے وقت جاگیردار اتنے سنبھلے ہوئے نہیں تھے، اور نہ ہی کسان سب کے سب متحرک ہوئے تھے۔ دیہاتوں میں چلنے والی تحریک شہروں میں جاری تحریک کے ساتھ نہیں جڑ پائی تھی۔ کسان فوج متذبذب تھی اور آخر کار اس نے شہروں میں مزدوروں کو کچلنے کیلئے خاصی فورسز بھی فراہم کیں۔ جونہی سیمنووسکی گارڈز رجمنٹ نے ماسکو میں بغاوت پر قابو پالیا، زار نے بڑی زمینوں کی تقسیم کا منصوبہ ہی ترک کردیا اور ساتھ ہی اس نے قادر مطلق ہونے کا اختیار بھی حاصل کرلیا۔ تاہم انقلاب کی شکست نے دیہاتوں میں اپنے خاصے اثرات چھوڑے۔ حکومت نے زمینوں کے پرانی ادائیگیاں کرنی بند کردیں اور سائبیریا کو زور شور سے اپنی نوآبادیات بنانا شروع کردیا۔ خوفزدہ ہو چکے جاگیرداروں نے زمینوں کے کرائے میں رعایتیں دینی شروع کر دیں، یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی زمینوں کی دھڑا دھڑ فروخت بھی شروع کردی۔ انقلاب کی ان حاصلات سے خوشحال کسانوں نے کافی فائدہ اٹھایا جو زمین کرائے پر لینے یا پھر ان کو خریدنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

تاہم 9 نومبر 1906 کو نافذ ہونے والے قانون کے بعد نوخیز

صنعتکار بننے والے کسانوں کیلئے حالات انتہائی سازگار ہوگئے جو اعلیٰ اصلاحات کے نام پر فاتح ردانقلاب نے لاگو کیا تھا جس کے تحت چھوٹی سی چھوٹی مشترکہ کسان اقلیت کو بھی اکثریت کی خواہش کے برخلاف اور باوجود یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ مشترکہ اراضی کے کسی بھی حصے کو آزادانہ اپنی ملکیت بنا سکتی ہے۔ 9 نومبر کا یہ قانون کمیون کے خلاف ایک دھماکہ خیز سرمایہ دارانہ بم ثابت ہوا۔ وزارتی کونسل کے سربراہ سٹولی پن نے اس حکومتی پالیسی کو ان کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور ان کی معیشت مضبوط کرنے کی طرف پیش رفت قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خوشحال کسانوں کی بالا پرتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ ان ''خودمختار'' کمیونوں کی زمینوں کو خرید سکیں اور اس طرح یہ نئے سرمایہ دار کسان موجودہ حکومتی ڈھانچے کے ساتھ اپنی وابستگی کو پختہ کرلیں۔ یہ ہدف تجویز کے طور پر آسان معلوم پڑتا تھا لیکن عمل میں نہیں تھا۔ جاگیرداری کے مسئلے کے متبادل کے طور پر کسان مسئلے کو ابھارنے سے رد انقلاب کا مقصد ان کی گردن مروڑ دینا تھا۔

یکم جنوری 1916 تک اپنا اپنا گھر رکھنے والے 25 لاکھ کسان، 170 لاکھ ڈسیاٹن رقبے کے مالک بن چکے تھے۔ جبکہ بیس لاکھ مزید یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کو بھی 140 لاکھ ڈسیاٹن زمین الاٹ کی

جائے۔اصلاحات کے ضمن میں یہ ایک بہت عظیم الشان کامیابی نظر آتی ہے لیکن اپنا گھر رکھنے والوں کی اکثریت ابھی تک زندگی کو برقرار رکھنے کی اہلیت سے محروم تھی اور ان کا گذارہ محض فطرت کی مہربانیوں کا ہی مرہون منت تھا۔اس وقت جب بہت سے پسماندہ جاگیردار اپنی جاگیریں اور چھوٹے زمیندار اپنے اپنے قطعات اراضی بیچتے چلے جارہے تھے،ایک نیا سرمایہ دار کسان طبقہ ظہور پذیر ہوا جو زمینوں کا باقاعدہ خریدار بن گیا۔زراعت کا شعبہ ایک انتہائی مستحکم سرمایہ دارانہ عروج کی کیفیت میں داخل ہو چکا تھا۔روس سے زرعی برآمدات 1908 سے 1912 کے دوران ایک ارب روبل سے ڈیڑھ ارب روبل تک پہنچ گئی تھیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسانوں کی اکثریت پرولتاریہ میں تبدیل ہو چکی تھی اور دیہاتوں کے بالائی حصے منڈی میں زیادہ سے زیادہ مزدور بھیجتے چلے جارہے تھے۔

کسانوں کے مابین لازمی مشترکہ تعلقات کی جگہ لیتے ہوئے،ان کے مابین انتہائی نزاکت سے ایک رضا کارانہ تعاون کا تعلق قائم ہو چکا تھا جو چند ہی سالوں کے اندر اندر کسانوں کی اکثریت میں رچ بس گیا اور جلد ہی ان کے مابین لبرل اور جمہوی نظریاتی بحثوں کا محور بن گیا۔تاہم ان

کوآپریٹوز میں اصل طاقت پھر بھی امیر کسانوں کے ہاتھوں میں رہی اور جو آخری تجزیے میں انہی کے مفادات کا ہی تحفظ کرتی تھیں۔نرودنک دانشور، جنہوں نے اپنی ساری توجہ کا مرکز ہی ان کسان کوآپریٹوز کو بنایا ہوا تھا، بالآخر اپنی محبتیں مستحکم بورژوازی کی جھولی میں ڈالنے کامیاب ہو گئے تھے۔اسی ذریعے سے ہی ''سرمایہ دار مخالف'' سماجی انقلابیوں کی پارٹی کا سب سے بڑی سرمایہ دارانہ پارٹی کے ساتھ سیاسی اتحاد تشکیل پایا تھا۔لبرل ازم جو اگرچہ بظاہر رجعتی زرعی پالیسیوں کے خلاف پوزیشن لیتا تھا، تاہم اس نے کمیونوں کی سرمایہ دارانہ تباہی سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں ۔لبرل شہزادہ ٹراؤبٹسکائی لکھتا ہے کہ ''ملک میں ایک انتہائی طاقتور پیٹی بورژوازی کا ظہور ہو رہا ہے جو کہ اپنی نوعیت اور کیفیت میں متحدہ اشرافیہ اور سوشلسٹ تصورات سے بالکل الگ تھلگ اور منفرد ہے''۔لیکن اس قابل تعریف اعزاز کا ایک اور پہلو بھی ہے۔کمیونوں کی تباہی سے صرف طاقتور بورژوازی کا ہی ظہور نہیں ہو رہا ہوتا بلکہ اس کا مدمقابل بھی پیدا ہو رہا ہوتا ہے۔جنگ کے آغاز پر اپنی زمینیں بیچنے والے کسانوں کی تعداد، جن کو وہ سنبھالنے سے قاصر ہو چکے تھے، دس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس لاکھ روحیں ایسی تھیں جو پرولتاریہ آبادی میں

شامل ہو رہی تھیں ۔اس پر مستزاد ایک اچھا خاصا دھما کہ خیز مواد ان لاکھوں کسانوں کی شکل میں اس کیفیت میں جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا جن کے پلے کچھ بھی نہیں تھا اور جو اس انتظار میں زندگی بتائے چلے جا رہے تھے کہ ان کو شاید کبھی نہ کبھی زمین کا کوئی ٹکڑا ہی الاٹ ہو جائے گا۔ان حالات میں کسانوں کے اندر تضادات ایک دوسرے کو مارتے اور پیدا کرتے رہے، جنہوں نے شروع شروع میں روس میں بورژوا سماج کے ارتقا کو لفٹ ہی نہیں کروائی تھی۔نئ جنم لینے والی دیہاتی بورژوازی جس نے قدیم اور اپنے سے زیادہ طاقتور طبقہ مالکان کی سپورٹ کا ماحول تیار کرنا تھا، جلد ہی اسی طرح عام کسانوں کی دشمنی پر اتر آئی جس طرح سے مالکان کا قدیمی طبقہ عام لوگوں سے پیش آیا کرتا تھا۔اس سے پہلے کہ یہ مروجہ نظام کی سپورٹ کی طرف مائل ہوتا، اس نئ کسان بورژوازی کو اپنے لئے کسی قاعدے قانون کی ضرورت تھی جس کی مدد سے یہ اپنی فتح اور برتری کو قائم رکھ سکتی! ان حالات میں یہ امر کسی طور پر بھی حیران کن نہیں تھا کہ ریاستی ڈوما کے اندر کسان مسئلے نے خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی اور اس پر گرما گرم بحث کے باوجود سبھی یہی سمجھتے تھے کہ اس معاملے پر ابھی سیر حاصل گفتگو نہیں کی گئی۔ڈوما میں کسانوں کے نمائندے اور نائب پیٹر تچینکو نے اپنے خطاب میں کہا ”ہم

جتنی بھی بحث کرلیں اس سے ہم کوئی نئی دھرتی تخلیق نہیں کر سکتے، کوئی نئی زمین ایجادنہیں کر سکتے، میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں زمین دی جائے'' یہ الفاظ نہ کسی بالشویک کے ہیں نہ ہی کسی سوشل انقلابی کے، بلکہ ایک رجعتی نائب اور درباری کے ہیں۔

زرعی تحریک بھی جو شہروں میں مزدوروں کی ہڑتالی تحریک کی طرح سے 1907 کے آخر تک تھک ہار چکی تھی۔ 1908 میں دوبارہ کسی حد تک اپنی سانسیں بحال کر چکی تھی اور پھر آنے والے سالوں میں یہ ارتقا کرتی رہی۔ جدوجہد کا زیادہ تر رجحان اور میلان کمیونوں کی طرف منتقل ہو رہا تھا اور یہ برحق بھی تھا کہ ردعمل اپنا سیاسی اظہار تلاش کر رہا تھا۔ کمیونوں کے رقبے کی تقسیم کے دوران ہمیں کوئی بھی مسلح تصادم یا تنازعہ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جاگیرداروں کے خلاف ہمیں کہیں بھی کم یا ختم ہوتی نظر نہیں آتی اور کسان جاگیرداروں کے محلات، جنگلات، گوداموں پر حملے کرتے رہے اور اپنے خلاف ہونے والی ہر کاروائی کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔

کسانوں کے یہ وہ حالات تھے جو جنگ کو اپنے آغاز پر درپیش آئے تھے۔ حکومت نے ایک کروڑ مزدور اور دو کروڑ گھوڑے میدان جنگ میں جھونک دیے۔ جس کی وجہ سے غریب دیہاتوں میں صورتحال کو اور بھی

بدتر کر دیا۔ ان کسانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی جو اپنی زمینیں کاشت کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ لیکن جنگ کے دوسرے سال درمیانے طبقے کے کسانوں کو بھی جنگ میں دھکیلا جانے لگا۔ یوں کسانوں کی جنگ کے خلاف نفرت اور دشمنی دن بدن بڑھنے لگی۔ اکتوبر 1916 میں پیٹروگراڈ میں آرمی ہیڈ کوارٹرز انتظامیہ کی رپورٹ کے مطابق ''دیہات والوں نے تو یہ سوچنا ہی بند کر دیا ہے کہ جنگ جیتی جا سکتی ہے، سب بے صبری سے انتظار اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ جنگ فوری طور پر بند کر دی جائے۔ یہی نہیں ہر جگہ سیاسی سوال اٹھائے اور زیر بحث لائے جائے رہے ہیں اور میٹنگوں جلسوں کے اندر جاگیرداروں اور تاجروں کے خلاف قراردادیں پیش اور منظور کی جا رہی ہیں۔ مختلف تنظیمیں آپس میں مل کر ایک ہوتی جا رہی ہیں، اس کے باوجود ابھی تک یہ ایک مرکز نہیں بنا سکی ہیں، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ کسان اپنی کوآپریٹوز کے گرد اکٹھے اور ایک ہو جائیں جو کہ دن بدن سارے روس کے اندر پھیلتی ہی جا رہی ہیں'' یہ رپورٹیں انشورنس ایجنٹوں، استادوں اور تاجروں کی دی گئی معلومات پر مبنی تھیں، تاہم اگرچہ اس رپورٹ میں کچھ مبالغہ آرائی بھی کی گئی ہے اس کے باوجود بھی اس کے مندرجات بنیادی سطح پر درست اور بجا ہیں۔

بالادست طبقات اس بات کا ادراک نہیں کر سکے کہ یہ دیہات ہی تھا جوکہ ان کے لاڈ،ان کے ناز نخرے اوران کے ہر جے خرچے برداشت کر رہا تھا۔لیکن ان کو اس بارے کوئی پرواہ نہیں تھی اور وہ اس کے مضمرات و عواقب سے پوری طرح بے نیاز تھے اور سمجھ رہے تھے کہ سب خیر خیریت سے نمٹ جائے گا۔اس موضوع پر فرانسیسی سفیر پالیولاگ جوکہ خاصی متجسس طبیعت کا حامل تھا، نے جنگ کے دوران ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں سابق وزیر زراعت کریوشائن، سابق وزیراعظم کوکوستیو، رئیس اعظم نواب بوبرنسکی، عظیم صنعتکار پوٹیلوف، ڈوما کا سربراہ روڈزیانکو اور کئی دوسرے مقتدر افراد شامل تھے۔اس بحث مباحثے میں جو کچھ فرانسیسی سفیر کے سامنے آیا، وہ کچھ اس طرح ہے؛ ایک موثر اور کارآمد زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کیلئے تین لاکھ اہلکاران کی فوج کی ضرورت پڑے گی جوکہ مسلسل پندرہ سالوں تک اپنے فرائض منصبی سرانجام دے گی، لیکن تب تک بے گھر بے زمین کسانوں کی تعداد تین کروڑ سے تجاوز کر چکی ہوگی، لہٰذا ہماری تمام تر کاوشیں اور حفاظتی تدابیر بے سود و رائیگاں چلی جائیں گی؛ چنانچہ ان جاگیرداروں افسروں اور بینکاروں کی نظر میں زرعی اصلاحات محض دائرے کے درمیان سفر کرتے رہنے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے

کہ ریاضی کے ان اعداد وشمار کا ،اور اس قسم کی جمع تفریق کا کسانوں کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔سفیر کا خیال تھا کہ پہلے ان جاگیرداروں کا قلع قمع کر دیا جائے اس کے بعد دیکھی جائے گی۔

اگر دیہات جنگ کے دوران نسبتاً پرامن خاموش اور غیر متحرک رہا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی سرگرم پرتیں اور قوتیں محاذ پر گئی ہوئی تھیں۔ لیکن سپاہی، جب وہ موت کا سامنا نہیں کر رہے ہوتے تھے وہ اپنے گھر بار اپنی اپنے کھیت کھلیانوں کے بارے ہی سوچتے تھے جبکہ اپنے مستقبل بارے غور وفکر کرتے ہوئے روسی کسان کی سوچیں تک بھی بھیگ جاتی تھیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اپنے حالات سے لڑتا ،بندوق چلانا سیکھتا اور واقعات سے سبق حاصل کرتا کسان،اپنے اندر وہ طاقت تخلیق کرنے سے قاصر تھا جس کے ذریعے وہ زرعی جمہوری انقلاب برپا کرسکتا،اپنے لئے خود اپنا انقلاب کرسکتا۔اسے قیادت کی ضرورت تھی اور عالمی تاریخ میں یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ کسان کو مزدور کی شکل میں ایک لیڈر کی ضرورت پیش آن پڑی تھی۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ روسی انقلاب اور اس سے پہلے ہونے والے انقلابوں کے مابین یہی بنیادی اور مرکزی فرق ہے۔

برطانیہ میں مزارعت اپنے حقیقی معنوں میں چودھویں صدی کے اختتام

تک ختم ہو چکی تھی۔ اور یہ روس میں مزارعت کے ابھرنے سے دو صدیاں پہلے کی اور اس کے ختم ہونے سے ساڑھے چار سو سال پہلے کی بات ہے۔ برطانیہ کے اندر کسانوں سے زمین لینے کا عمل اصلاحات اور بعد میں انیسویں صدی کے دو انقلابات کے ذریعے سرانجام پا چکا تھا۔ سرمایہ دارانہ ترقی جس پر کوئی بیرونی دباؤ نہیں تھا، چنانچہ اس کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ انفرادی زمینداری کا خاتمہ کر دے اور جو اس نے پرولتاریہ کی سیاسی بیداری سے قبل ہی کر دیا تھا۔

فرانس میں شاہی مطلق العنانیت، اشرافیہ اور پاپائیت کے خلاف جدوجہد نے بورژوازی کی کئی پرتوں کو مجبور کیا کہ وہ دھیرے دھیرے کئی قسطوں میں، اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہی ایک ریڈیکل کسان انقلاب برپا کر دے۔ اس کے کافی عرصے بعد جا کر ہی آزاد کسان طبقے نے بورژوازی نظام کی حمایت کا اظہار کیا تھا اور 1871 میں اس نے پیرس کمیون کو ختم کرنے میں بورژوازی کی مدد کی تھی۔

جرمنی میں بورژوازی کسان مسئلے کا انقلابی حل کرنے میں نااہل ثابت ہو گئی تھی اور اس نے 1848 میں جاگیرداروں کے ساتھ مل کر کسانوں سے غداری کی تھی، ویسی ہی جس طرح لوتھر نے تین صدیاں قبل کسان جنگوں

کے دوران شہزادوں کے ساتھ ملی بھگت کر کے کسانوں کے ساتھ کی تھی ۔دوسری طرف جرمنی کا پرولتاریہ انیسویں صدی کے وسط میں بہت کمزور تھا اوراس قابل نہیں تھا کہ وہ کسانوں کی قیادت کر سکے جس کے نتیجے میں جرمنی کی سرمایہ دارانہ ترقی کو سنبھلنے کیلئے کافی وقت مل گیا کہ وہ زراعت کو اپنے ماتحت کر سکے۔اگرچہ یہ اتنا طویل عرصہ نہیں تھا جتنا برطانیہ کو ملا تھا اور پھر یہ انقلاب اپنے اندر نامکمل تھا جو کہ محض اپنے ہی مفادات کے گرد قائم ہوا تھا۔

روس میں 1861 میں اشرافیہ اور افسر شاہی کے ہاتھوں کی جانے والی زرعی اصلاحات،ایک ایسے بورژوا سماج کی ضروریات کے دباؤ کے تحت کی گئیں جس میں بورژوازی مکمل طور پر بے اثر اور بے طاقت تھی۔کسانوں کی اس نجات کا کردار اس نوعیت کا تھا کہ اس نے ملک کی سرمایہ دارانہ خطوط پر بدلنے کی ضرورت کو مجبور کر دیا کہ وہ زرعی مسئلے کو انقلاب کے مسئلے میں بدل ڈالے۔روسی بورژوازی کا خیال تھا کہ وہ زرعی مسئلے کا ارتقا فرانس،ڈنمارک یا امریکہ کی طرز ارتقا پر خود بخود ہوتا چلا جائے گا۔وہ خود کچھ کرنے سے خود کو بری الذمہ رکھنا چاہتا تھا اور اس بات کو نظر انداز کر رہا تھا کہ وہ فرانس کی طرز پر یا پھر امریکی ڈھانچے کی طرح سے خود کو سنوار اور سنبھال لیتا۔جمہوریت پسند دانشور اپنے ماضی کی روایات کے برعکس آخری فیصلہ کن وقت پر لبرل

بورژوازی اور جاگیرداروں کے ساتھ مل گئے اور انقلابی دھارے سے الگ ہوکر کھڑے ہوگئے۔ان حالات میں صرف پرولتاریہ ہی تھا کہ جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوکر کسان انقلاب کا فریضہ سرانجام دیتا اور جو اس نے دیا بھی!

پسماندہ ملکوں کا مشترکہ ترقی کا قانون،ایک ایسی کیفیت میں جس میں انتہائی پسماندہ عناصر انتہائی جدید عوامل کے ساتھ خلط ملط ہو رہے تھے،اپنی نفیس ترین شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے اور جو ہمیں روسی انقلاب کا معمہ سمجھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔بربریت پر مبنی اپنی قدیم روسی تاریخ کے ورثے کا حامل زرعی مسئلہ اگر بورژوازی کے ہاتھوں حل ہوتا،اگر وہ اسے حل کرنے کی اہل ہوتی تو ممکن تھا کہ روسی پرولتاریہ شاید 1917 میں اقتدار حاصل نہ کر پاتا۔سوویت ریاست کے حصول کیلئے لازمی تھا کہ تاریخ کے دو انتہائی مختلف عناصر باہمی اشتراک ،ہم آہنگی اور تعاون سے جدوجہد کرتے؛ایک کسان جنگ جو اپنی خصوصیات میں ایک ایسی تحریک ہوا کرتی ہے جو بورژوا ترقی کے عروج کا رستہ ہموار کرتی ہے اور دوسری پرولتاریہ بغاوت جو ایک ایسی تحریک ہوا کرتی ہے جو اس عروج کو زوال میں بدل کے رکھ دیا کرتی ہے،یہی 1917 کا نچوڑ ہے۔

****

(1)* نرودنک ان غیر مارکسیوں کا معروف نام ہے جو سمجھتے تھے کہ ''صرف عوام'' کے پاس جانے سے ہی ایک ''نیا روس'' تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ انہی نے سماجی انقلابی (سوشل ریولیوشنری) پارٹی قائم کی تھی۔ منشویک جو مارکسیوں یا سوشل ڈیموکریٹس کا دایاں بازو تھے، جن سے لینن 1903 میں الگ ہو گیا تھا۔

(2)* دیسیاٹن، روسی لفظ ہے جو زمین کی پیمائش کیلئے استعمال ہوتا ہے اور جو 2.702 ایکڑ کے برابر ہوتا ہے۔

کتاب نامکمل ہے